علامہ اقبال کو منظوم خراج عقیدت

(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل اقبالیات
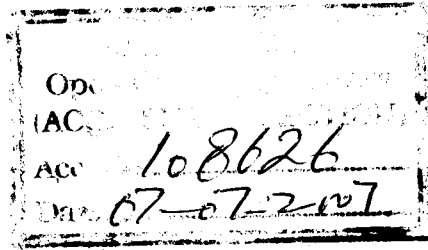
مقالہ نگار — نگران

سعدیہ حسن — ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

رجسٹریشن نمبر 98-PLE-3597

استاد شعبہ اردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور۔

شعبہ اقبالیات

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

2006ء

رفیع الدین ہاشمی

۲۸ زی منصورہ، لاہور

فون: ۵۴۳۳۲۰۷۳

rdhashmi@yahoo.com

محترمہ سعدیہ حسن نے راقم کی نگرانی میں،
علامہ اقبال کو منظوم خراجِ عقیدت:
تحقیقی و تنقیدی جائزہ کے موضوع پر ایم فل
اقبالیات کے لیے مقالہ تیار کیا ہے۔ میری دانست
میں یہ مقالہ اس لائق ہے کہ اسے ایم فل کی
ڈگری کے لیے پیش کیا جائے ـــــ مزید کارروائی
کے لیے، ارسال ہے۔

رفیع الدین ہاشمی

(نگران)

فہرست

باب اول:

باب دوم:

پیش لفظ

تمام تعریفیں اس ذات بابرکات کے لیے ہیں جس نے آج میرے قلم کو پیش لفظ لکھنے کی توفیق بخشی۔ اور تشکر و امتنان کے جذبات اپنے محترم و مشفق والد گرامی پروفیسر جعفر بلوچ کے لیے ہیں جنھوں نے میرے اس مقالے کا موضوع تجویز کیا۔

مقالے کے موضوع: ''علامہ اقبال کو منظوم خراجِ عقیدت، تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' سے آغاز میں مجھے بہت اجنبیت محسوس ہوئی۔ کیونکہ میرے نزدیک منظوم خراج عقیدت شعری اصناف میں سے کس صنف کے زمرے میں نہیں آتی تھی۔ اگرچہ عالمی ادب کی تمام شعری اصناف میں اس کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اسی لیے پہلے باب کا عنوان ''منظوم خراج تحسین، ادب کی ایک مستحکم روایت'' رکھا گیا۔ اس روایت کا سراغ لگانے کے لیے عالمی ادب سے عربی اور فارسی ادب سے مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ کیونکہ عربی اور فارسی کی روایت اردو ادب کے لیے بنیاد کا کام بھی دیتی ہے۔ اور اردو میں تقریباً سبھی اصناف اسی روایت کی مرہون منت ہیں۔ پھر اصناف کی ایک طویل فہرست میں سے قصیدہ، مرثیہ اور نعت کا انتخاب ترجیحاً کیا گیا۔ کیونکہ مدح و تحسین کے جذبات کا بیان بیشتر انہی اصناف کا حصہ ہے۔ باب اول کی دوسری فصل ''اردو شاعری میں منظوم خراج تحسین کی روایات'' کے عنوان سے ہے۔ اس فصل میں ولی سے لے کر اقبال تک اردو شاعری میں مدح و تحسین کے آثار کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ فصل سوم میں علامہ اقبال کی اس شعری روایت کی پیروی کا جائزہ لیا گیا ہے۔

باب دوم ''منظوم خراج عقیدت، حیات اقبال میں'' اقبال کو ان کی زندگی میں شعرائے کرام کی طرف سے وقتاً فوقتاً پیش کیے جانے والے ہدیہ ہائے عقیدت سے بحث کرتا ہے۔ اس باب میں پہلی نظم ۱۹۰۴ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک ترتیب کے ساتھ، باعتبار سنین شعرائے ہند و عرب کی تحسینی منظومات کا ذکر کیا گیا ہے۔ حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ معروف و غیر معروف سے قطع نظر کرتے ہوئے تمام شعرا کے مدحیہ جذبات کی ترجمانی کی جائے۔ تاہم ان شعرا کی منظومات کو خصوصی توجہ دی گئی ہے جن کا شمار اقبال کے قریبی احباب اور ذہنی ہم آہنگی رکھنے والے شعرا میں ہوتا تھا۔ اور آج یہ تمام منظومات اقبالیات کے حوالے سے بجائے خود تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

باب سوم بعنوان ''منظوم خراجِ عقیدت بعد از مرگ'' کی فصل اول میں اقبال کی وفات کے فوراً بعد ہندوستان کے

اخبارات کے ردعمل کی تلاش میں مجھے خاصی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اس عہد کے اخبارات اب بہت کم یاب ہیں اس کے باوجود مرثیوں کی اتنی بڑی تعداد دستیاب ہوگئی کہ انتخاب مشکل ہوگیا۔لہذا میں نے اقبالؔ کے احباب اوران کے ہم عصروں کوترجیح دیتے ہوئے اس باب میں ان کی منظومات کا ذکر کیا ہے۔اس انتخاب کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ کہ اس باب میں مراثی ونوحوں کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ یہ مرثیے اقبالؔ کی وفات کے فوراً بعد لکھے گئے۔جبکہ دورِ جدید میں شعرا کا موضوع غمِ اقبال سے زیادہ عظمت اقبال ہے۔

باب چہارم بعنوان ''منظومات کا اصناف وار تجزیہ'' میں ان شعرا کی منظومات کو خاص طور پر جگہ دی گئی ہے جنھوں نے قیام پاکستان سے لے کر اب تک مختلف اصناف میں اقبال کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا اور کررہے ہیں۔اصناف کی تقسیم اعتبار ہئیت اور موضوع دونوں طرح سے کی گئی ہے اور (۱۱) گیارہ اصناف شعر میں مدح وتحسین اقبال کے موضوع پر بحث کی گئی ہے۔

حاصل بحث میں منظوم خراجِ تحسین پر اپنی تحقیق کا نچوڑ اور خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔حاصل بحث تک پہنچتے پہنچتے خود اقبال سے میری اپنی عقیدت واحترام میں اس حدتک اضافہ ہوگیا کہ شاید قارئین کو میری تحریر کے اس حصے میں قدرے مبالغہ آرائی کا شائبہ نظر آئے مگر مجھے میر تقی میر کا یہ شعر یاد آتا ہے:۔

چاہنے کا ہم پہ خوباں جو دھرتے ہیں گناہ
ان سے بھی پوچھے کوئی تم اتنے پیارے کیوں ہوئے

اور اب آخر میں مجھے تشکر و امتنان کے خوشگوار فریضے سے عہدہ برا ہونا ہے۔سب سے پہلے میں اپنے نگران پروفیسر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی صاحب کی شکر گذار ہوں جنھوں نے اس مقالے کے مختلف مراحل میں میری رہنمائی کی۔

دوران تحقیق لاہور کی لائبریریوں میں سے پنجاب یونیورسٹی کے لائبریرین اوران کے عملے نے جس طرح میری مدد فرمائی۔اس کے لیے میں ان کی شکر گذار ہوں۔لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی کی لائبریرین محترمہ حنا عزیز صاحبہ اور اُن کا عملہ بھی خصوصی شکریے کے حق دار ہیں۔جنھوں نے میرے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔

اقبال اکادمی پاکستان لاہور کے لائبریرین محترم حافظ خادم علی جاوید صاحب بھی شکریے کے مستحق ہیں جنہیں میں نے دن رات کی تفریق کیے بغیر کتابوں کے حصول کے لیے زحمت دی اور وہ اس ''زحمت'' کو اپنے لیے ''رحمت'' خیال کرتے رہے۔

احباب میں سے محترمہ پروفیسر نائلہ انجم اور محترمہ پروفیسر عالیہ امام کی انتہائی شکر گذار ہوں جو مجھے وقتاً فوقتاً اوری اینٹل کالج لائبریری اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لائبریری سے کتابیں فراہم کرتی رہیں۔

اور سب سے آخر میں اپنے اہل خانہ میں سے اپنے بہت شفیق بابا جان (ڈاکٹر سید معراج نیرؔ زیدی) اور ماما (پروفیسر رباب بانو) کی تہہ دل سے شکر گذار ہوں جنہوں نے اس مقالے کی تکمیل کے لیے میری حتی المقدور مدد اور حوصلہ افزائی

فرمائی۔ میرے بھائی حامد حسن بلوچ اور محمد شعیب بلوچ بھی خصوصی شکریے کے حق دار ہیں جنھوں نے مقالے کی کمپوزنگ اور فراہمی کتب کے لیے مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔

میرے ہمسر گرامی (پروفیسر غلام صابر) اور بچگان (شاہ بانو بتول اور محمد یحیٰی نیّر) بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تحریر مقالہ کے لیے مجھے پر سکون فرصت فراہم کی۔ خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ ان سب کو جزائے احسن عطا فرمائے۔ آمین

سعدیہ حسن

رجسٹریشن نمبر 98-PLE-3597

۲۷ مئی ۲۰۰۶ء

بمطابق ۲۸ ربیع الثانی ۱۴۲۷ھ

باب اوّل:

منظوم خراجِ تحسین ۔ ادب کی ایک مستحکم روایت

فصلِ اوّل:۔ عربی اور فارسی شاعری میں منظوم خراجِ عقیدت کی روایت ،مختلف اصنافِ شعر کے حوالے سے

(i) عربی شاعری میں مدح گوئی

(ii) فارسی شاعری میں مدح وتحسین

فصلِ دوم:۔ اردو شاعری میں منظوم خراجِ تحسین کی روایت از آغاز اقبالؔ

(i) اردو قصیدے میں مدح نگاری

(ii) اردو مرثیے میں شخصی تحسین

(iii) اردو نعت اور تحسینِ ممدوحِ عالم

فصلِ سوّم:۔ بعض نامور شعرا کو اقبالؔ کا منظوم خراجِ تحسین

فصل اوّل:

عربی اور فارسی شاعری میں منظوم خراجِ عقیدت
(مختلف اصنافِ شعر کے حوالے سے)

انسانی فطرت میں ''مدح'' کا جذبہ بھی دیگر جذبات کی طرح اوائل ہی سے موجود رہا ہے۔ پیشہ ورانہ مجبوریوں کے تحت کی جانے والی مدح کے علاوہ، مذہبی یا غیر مذہبی مدح انسان کے بے اختیار جذبوں کی تابع ہے۔ کسی کی موت پر ایسی بے اختیار چیخ جس میں اس شخص کی خوبیوں اور صفات کا ذکر ہو، مرثیہ کہلاتی ہے۔ اور کسی برتر ہستی کے لیے تشکر و امتنان اور اظہارِ عقیدت کے جذبات یا کسی زندہ انسان کی خوبیوں، صفات اور کارناموں کا بیان قصیدہ کی ذیل میں آتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کا انحصار ان قوموں کے بلند و پست حوصلوں پر ہوتا ہے۔ قوموں کا بننا، ابھرنا اور ان کے جذبات کا تازہ ہوتے رہنا اس بات پر موقوف ہے کہ ان کے اوصاف کی صحیح داد دی جائے۔ ان کے کارنامے نمایاں اور اجاگر کیے جائیں۔ علامہ شبلی نعمانی کہتے ہیں:-

> ''عمدہ اوصاف اور جذبات کو قوم میں پھیلانا ہو تو اس کا سب سے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ان کی محسوس اور زندہ مثالیں پیش کی جائیں۔''[۱]

قوموں کے لیے تاریخ کو زندہ رکھنا اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنے اسلاف کے علمی کارناموں کو نہ صرف زندہ رکھیں، ان سے استفادہ کریں بلکہ ان کے نامِ نیک کو بھی زندہ رکھیں تاکہ وہ خود زندہ و پائندہ رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ سے دنیائے ادب کی روایات تنقید و تحسین میں سے ایک روایت اہلِ کمال کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے کی رہی ہے۔ مگر یہ روایت تا حال کسی مخصوص صنفِ سخن کے نام سے محروم ہے، تاہم تعریف و تحسین کے یہ بے بہا لعل شاعری کی مختلف اصناف میں بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

---

[۱] شبلی نعمانی: شعر العجم، جلد پنجم (الہ آباد، مطبع انوار محمدی، س۔ن) ص ۲۶

(الف) عربی قصیدے میں شخصی تحسین کے آثار

سب سے پہلے عربی شاعری میں قصیدہ ایسی صنف ہے جس کا مقصد قابلِ ذکر و فخر شخصیات کی مدح سرائی ہے۔ اس میں ہمیں منظوم خراجِ عقیدت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ عربوں میں شاعر کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ اسے مافوق الفطرت قوتوں سے متصف سمجھتے تھے۔ اس کے کلام سے قبیلے کے کارنامے شہرت دوام حاصل کر لیتے تھے اور دشمنوں پر ہراس چھا جاتا تھا۔ وہ اپنے فصیح و بلیغ کلام سے قبیلے کی نیک نامی کو چار چاند لگا دیتا تھا۔ اور یہ فصاحت و بلاغت عربی شاعری کی تمام اصناف میں سب سے زیادہ قصیدے کے حصے میں آئی ہے۔ قصیدہ عربی شاعری کی اس قدر مکمل اور ترقی یافتہ شکل ہے کہ تقریباً ڈھائی ہزار سال گزر جانے کے بعد بھی زمانۂ جاہلیت کے قصائد مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ قصیدہ عربی کی بہترین صنف سخن ہے اور جس زمانے میں قصیدہ عروج پر تھا، اسے عربی شاعری کا بہترین دور کہا جاتا ہے۔ عربی ادب کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ الادب الجاھلی ۲۔ الادب الاسلامی

زمانۂ جاہلیت کے شعرا الشعرا الجاھلیون ،اور زمانۂ اسلام کے شعرا الشعرا الاسلامیون کہلاتے ہیں۔ اگرچہ دور جاہلیت کی شاعری کا بہت کم حصہ ہم تک پہنچ سکا ہے، پھر بھی شعرا کی فہرست بہت طویل ہے تاہم جاہلی شاعری کی موثر نمائندگی المعلقات میں ہوجاتی ہے۔ عربی زبان کے وہ منظوم قصیدے جو سبع معلقات کہلاتے ہیں انھیں ادبی دنیا میں ہمہ گیر شہرت حاصل ہے۔ احمد حسن الزیات لکھتے ہیں:

> ''یہ قصائد تمام مورخین کے خیال کے مطابق عربوں کے منتخب اور پسندیدہ قصائد تھے جنھیں آبِ زر سے وصیلوں پر لکھ کر اظہار مقبولیت اور دائمی شہرت کے لیے کعبہ پر آویزاں کر دیا گیا''۔[۱]

عربی قصیدے کے ارکان تشبیب ،گریز ،مدح، حسن طلب اور دعا میں سے ''مدح'' کا براہ راست تعلق منظوم خراج عقیدت سے ہے، لہٰذا ہم اسی سے بحث کریں گے۔

قصیدے کا اصل موضوع ''مدح'' ہے۔ ''مدح'' کی بعض شرائط بھی ہیں:

۱۔ جس کی مدح کی جائے، وہ درحقیقت مدح کے قابل ہو۔

۲۔ مدح میں جو کہا جائے سچ کہا جائے۔

۳۔ مدحیہ اوصاف اس انداز سے بیان کیے جائیں کہ جذبات کو تحریک ہو۔

سبع معلقات کے حصۂ مدح کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان معلقات میں ممدوح کوئی واحد ہستی نہیں ہے۔ کہیں تو وہ ممدوح شاعر کی محبوبہ ہے جو اس سے جدا ہے اور شاعر اسے ڈھونڈنے کے لیے اس کے اجڑے دیار کا رخ کرتا ہے، اس کی منظر کشی کرتا ہے، ہجر و وصال کا درد اور لذتیں بیان کرتا ہے، محبوبہ کے حسن و جمال کو سراہتا ہے،

---

[۱] احمد حسن الزیات : تاریخ ادبِ عربی (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۲ء) ص ۸۰

کہیں شاعر گھوڑے کی مدح کرتا ہے، کہیں اپنی تلوار کے اوصاف بیان کرتا ہے، اس کے باوصف ان قصائد کا اہم ترین اور قابل ذکر موضوع مفاخرت ہے، جس میں شاعر اپنے کارناموں کو جوش و خروش سے بیان کرتا ہے۔ سبع معلقات میں پانچواں معلقہ عمرو بن کلثوم کا ہے جس کے شانِ نزول کے حوالے سے شبلی نعمانی نے شعر العجم میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ عرب کے بادشاہ عمرو بن الہند نے ایک دن درباریوں سے کہا کہ کیا اب بھی عرب میں کوئی ایسا شخص ہے جس کو میرے سامنے گردن جھکانے سے عار ہو؟ لوگوں نے کہا: ہاں، عمرو بن کلثوم (قبیلۂ تغلب کا شاعر)۔ بادشاہ نے اُسے اور اس کی مستورات کو بلایا۔ عمرو بن کلثوم دربار میں اور عورتیں شاہی حرم میں گئیں۔ بادشاہ کی ماں نے عمرو بن کلثوم کی ماں سے کسی چیز کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اٹھا دینا۔ اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ کی ماں نے دوبارہ کہا تو وہ چیخ کر پکاری واتغلباہ والاذلاہ ہائے تغلب کی ذلت۔ عمرو بن کلثوم نے باہر سے آواز سنی، سمجھا کہ ماں کی تحقیر کی گئی۔ اسی وقت بادشاہ کا سر اڑا دیا اور دونوں قبیلوں میں زبردست لڑائی ہوئی۔ اس پر عمرو بن کلثوم نے قصیدہ لکھا اور عکاظ کے میلے میں سنایا۔ مولانا شبلی نعمانی رقم طراز ہیں:

> ''اہلِ ادب کا بیان ہے کہ دوسو برس تک اس قصیدے نے قبیلۂ تغلب میں شجاعت کا جوش قائم رکھا''۔[1]

اس قصیدے کا ایک ایک شعر جوش و غیرت، حمیت و آزادی اور دلیری کے جذبات سے معمور ہے۔ بادشاہ کو مخاطب کر کے شاعر کہتا ہے۔

ابا هند فلا تعجل علينا — وانظرنا نخبرک اليقينا

بانا نورد الرايات بيضا — ونصدر هن حمرا قد روينا

الالا يجهلن احدٌ علينا — فنجهل فوق جهل الجاهلينا

اذا بلغ الفصام لنا صبی — تخرله الجبابر ساجدينا[2]

ترجمہ:-

> اے ابو ہند! جلدی نہ کر ہم تجھے سچے واقعات بتاتے ہیں۔ ہم معرکہ جنگ میں سفید جھنڈی لے کر جاتے ہیں اور اس کو سرخ کر کے لاتے ہیں۔ ہاں ہم سے کوئی جہالت نہ کرے ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کریں گے۔ ہماری قوم کا بچہ جب دودھ چھوڑتا ہے تو بڑے بڑے جبار اس کے آگے سجدہ میں گر جاتے ہیں۔

ظہور اسلام اور نزولِ قرآن کے بعد عربی قصیدے کی ساخت یا ترتیب میں کوئی بہت بڑا تغیر واقع نہیں ہوا۔ اسی طرح

[1] علامہ شبلی نعمانی: شعر العجم، جلد پنجم، ص ۳۰

[2] خورشید رضوی، ڈاکٹر: عربی شاعری ایک تعارف (لاہور، شیخ زاید اسلامک سنٹر، ۲۰۰۱ء) ص ۴۵

لفظی ومعنوی اسالیب میں بھی کوئی کمی وبیشی نہ ہوئی تاہم صدرِ اسلام کے شعرا نے مدح میں مبالغہ آرائی اور ہجو میں فحش گوئی سے اجتناب کیا۔ جبکہ جاہلی دور کے شعرا میں یہ عناصر موجود ہیں۔ اسی طرح غزل وتشبیب میں بھی عفت وپاکیزگی کو ملحوظ رکھا گیا۔

اس دور کے قصائد کے ''حصہ مدح'' کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ''مدح'' میں اسلامی آداب کا خیال رکھا گیا ہے۔ مدح جائز اور سچ پر مبنی ہوتی تھی۔ عرب کے اکثر شعرا اس وقت مدحیہ قصائد لکھتے تھے جب ممدوح واقعی کوئی معرکہ سر کرتا تھا۔ معتصم باللہ کے تاریخی واقعے کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ جب اس نے ایک مسلمان عورت نے مدد کے لیے آواز دی اور معتصم اپنی فوجیں دوڑاتا اس کی مدد کے لیے گیا۔ ایک منجم نے زائچہ دیکھ کر کہا کہ شکست ہوگی۔ مگر معتصم نہ مانا۔ فتح کے بعد واپس آیا تو ابوتمام نامی قصیدہ نگار نے منجم کی طرف اشارہ کرکے یہ اشعار سنائے:[1]

السیف اصدق انباءِ من الکتب

فی حده الحدُّ بین الجدوالعب

والعلم فی شهب الارماح لامعة

بین الخمیسین لافی السبّعَةِ الشهب

ترجمہ:-

تلوار کتابوں کی نسبت زیادہ سچ بولتی ہے اس کی باڑھ سنجیدگی اور مسخراپن کی حدِ فاصل ہے۔ علم برچھیوں کے شعلوں میں چمکتا ہے نہ کہ سبعہ سیارہ میں۔

اسلامی شاعری میں قصیدے کا ذکر فرزدق اور جریر کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے۔ اموی دور کی ادبی فضا پر جریر اور فرزدق کا بطور خاص تسلط رہا۔ اردو ادب کے انشاؔ و مصحفیؔ کی طرح ان دونوں کی آپس میں شدید ہجو گوئی تھی۔ یہ قصائد ''نقائض جریر والفرزدق'' کہلاتے ہیں۔ فرزدق کے ہاں الفاظ کا شکوہ، لغت کے نامانوس الفاظ اور قدیم عرب کی تلمیحات کا غلبہ ہے۔ فرزدق کے قصائد میں اس کا قصیدۂ میمیہ غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ قصیدہ اس نے امام زین العابدینؒ کی شان میں کہا۔ روایت ہے کہ ہشام بن عبدالمالک حج کے دوران کثرتِ اژدہام کے باعث حجر اسود کا بوسہ نہ دے سکا۔ مگر جب حضرت علی بن الحسین یعنی امام زین العابدین طواف کرتے ہیں تو ہجوم چھٹ گیا۔ سرداران شام نے پوچھا کہ یہ کون ہے جس کی ایسی توقیر ہے؟ ہشام نے کہہ دیا: میں نہیں جانتا۔ اس پر فرزدق جو وہاں موجود تھا، بول اٹھا میں جانتا ہوں اور اپنا قصیدۂ میمیہ فی البدیہہ پیش کیا:[2]

هٰذا الذی تعرف البطحاء وطأته

والبیت یعرفُه، والحلُّ والحرم

---

[1] شعرالعجم (جلد پنجم) : ص ۲۸

هٰذا ابن خیر عباد اللّٰہ کلّہم
هٰذاالتقی النقی الطاهر العلمُ
ولیس قولک من هٰذا الضائر ہ
العرب تعرف من انکرت والعجمُ
اذا راتہٗ قریش قال قائلها
الٰی مکارم هٰذا ینتهی الکرمُ

ترجمہ:-

یہ وہ شخص ہے کہ وادیِ مکہ اس کے لمس قدم کو پہچانتی ہے اور بیت اللہ کے باہر اور اندر کا سب علاقہ بھی اس سے آشنا ہے۔ یہ شخص بندگانِ الٰہی میں سے بہترین شخصیت یعنی حضورؐ کی اولاد ہے یہ متقی ،برگزیدہ، پاکیزہ اور ممتاز و معروف انسان۔ اور تیرا یہ کہنا کہ ''یہ کون ہے''؟ اسے کچھ ضرر نہیں پہنچا سکتا۔ جسے تو نہ پہچان سکا اسے عرب اور عجم سب پہچانتے ہیں۔ جب اہلِ قریش اسے دیکھتے ہیں تو ان کا کہنے والا کہتا ہے کہ بزرگی کی انتہا اس شخص کے افعال بزرگانہ پر ہوتی ہے۔

فی الواقع امام زین العابدین کی شان میں فرزدق کا یہ قصیدہ عربی شاعری میں منظوم خراج عقیدت کی بہترین مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

جدید عربی شاعری کی نشاۃ ثانیہ سے قبل کے ادوار میں عربی قصیدے پر جمود طاری رہا۔ موضوع اور ساخت کے اعتبار سے کوئی تبدیلی نہیں آئی البتہ لفظی صنائع وبدائع کے تکلفات پر زور دیا جاتا رہا۔ بعدازاں البارودیؔ، حافظؔ اور احمد شوقیؔ نے عربی قصیدے کو تازہ رعنائی اور رونق دی۔ مختصراً یہ کہ عربی شاعری میں قصیدہ ایک ایسی صنف سخن ہے جس میں ہمیں منظوم خراج عقیدت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

---

[1] عربی شاعری ایک تعارف: ص ۴۵

(ب) عربی مرثیہ اور شخصیات کی مدح وتحسین کے آثار

پھر عربی شاعری میں مرثیہ ایک ایسی صنفِ سخن نظر آتی ہے جس میں ہمیں عالی ہمت، بہادر، شجیع اور بلند کردار کے حامل اشخاص کی موت پر اظہار افسوس اور ان کی خوبیوں اور صفات کی ''مدح'' نظر آتی ہے۔ اور چونکہ منظوم خراجِ عقیدت کا تعلق براہ راست مدح سے ہے اس لیے ذیل میں عربی مرثیے کا مختصر تعارف وتاریخ درج کی جاتی ہے۔ عربوں کے ہاں مرثیہ گوئی اتنی ہی قدیم ہے جتنی ان کی شاعری۔ عرب شعرا مرنے والے کے مناقب ومحاسن اور اوصاف وکمالات بیان کرتے اور اس کی موت پر اپنے حزن وغم، رنج والم اور دردوکرب کا اظہار کرتے اور اسے بہت بڑا صدمہ ظاہر کرتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب شعرا اپنے بہادروں کے مرثیے اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے بھی کہتے تھے کہ اپنے قبیلے کو مقتول کا بدلہ لینے پر اکسائیں اور آتش انتقام برافروختہ کریں۔ مرثیہ گوئی کے اس شعری میدان میں مردوں کے ساتھ عوتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ علی احمد رفعت لکھتے ہیں:

> ''بلاغت، زورِ بیان اور دیگر شاعرانہ خوبیوں کے اعتبار سے ان میں سے بعض کا کلام مردوں کے کلام سے کسی طرح کمتر نہیں ہے ... مرثیہ گوئی میں بعض عرب شاعرات شاعروں سے بڑھی ہوتی تھیں''۔[1]

عرب مرثیہ گو شاعرات میں الخنساء کا نام سرفہرست ہے جنھوں نے قبل اور بعد از اسلام بھی مرثیے لکھے۔ دورِ جاہلیت میں خنساء نے اپنے بھائیوں معاویہ اور صخر کے غیر معمولی اسلوب کے حامل مرثیے لکھے۔ اپنے بھائی صخر کی یاد میں کہے گئے ان کے مرثیے کو تاریخی اہمیت حاصل ہے کہتی ہیں:[2]

یذکرنی طلوع الشمس صخرا
واذکرہ لکل غروب شمس
فیا لھفی علیہ ولھف أمی
أیصبح فی الضریح وفیہ یُمسی

ترجمہ:-

طلوعِ آفتاب مجھے صخر کی یاد دلاتا ہے اور ہر غروب آفتاب کے وقت میں اسے یاد کرتی ہوں۔
سو ہائے میرا افسوس اس پر اور میری ماں کا افسوس! کیا اب وہ صبح بھی قبر ہی میں کرے گا اور اسی میں شام کرے گا۔

---

[1] علی احمد رفعت: عربی ادب (بہاول پور، اردو اکادمی، ۱۹۶۲ء) ص ۱۲۷۔۱۲۸

[2] عربی شاعری: ص ۷۰

جب ان کا قبیلہ بنو سلیم ایمان لایا تو آپؓ بھی صحابیت کے شرف سے سرفراز ہوئیں حضورؐ کو آپ کا کلام پسند تھا۔روایت ہے کہ حضورؐ ہاتھ کے اشارے سے سنانے کی فرمائش کرتے اور فرماتے ھیہ یا خنساء ،ھاں اے خنساء اسلام کے اس ابتدائی عہد میں مشرکین نے اپنے مقتولوں اور مسلمان شعرا نے اپنے شہیدوں پر بھی مرثیے کہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے وصال پر بھی نہایت پرسوز اور دردانگیز مرثیے کہے گئے۔ پیارے نبیؐ کی شان میں کہے گئے یہ مراثی معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے عربی شاعری کے دیگر مراثی پر حاوی ہیں۔ یہ مرثیے اپنے اندر مرثیہ کے لوازم بھی رکھتے ہیں اور نعت کی خوبیاں بھی ان میں نظر آتی ہیں۔

پیارے نبیؐ کی وفات پر جن صحابہ کرامؓ نے مرثیے کہے،ان میں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ،حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ،حضرت علی مرتضیٰؓ،حضرت ابوسفیانؓ،ام المومنین حضرت عائشہؓ،حضرت فاطمۃ الزہرؓا،امام زین العابدین اور حضرت حسان بن ثابتؓ کے مرثیے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مرثیے عشق رسولؐ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ان سے آپ جیسی عظیم الشان ہستی کے قابل رشک و تقلید اوصاف و کمالات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

یـــاعیـــن فـــابـــکـــی ولاتسـامـی
وحـــق البـــکـــا عـــلـــی السیّـــد
فـکیف الـحیـــاۃ لِـفـقـد الـحبیـب
وزیـــن الـــمـــعـــاشـرفـی الـمشهـد

ترجمہ:۔

تو اے آنکھ خوب رو اب یہ آنسو نہ تھمیں۔قسم ہے سرورِ عالمؐ پر رونے کے حق کی۔ اب کیسی زندگی جو حبیب ہی بچھڑ گیا اور وہ نہ رہا جو زینت دہِ یک عالم تھا۔

ادبی محاسن کے اعتبار سے امام زین العابدینؒ کا مرثیہ فضیلت میں یکتا ہے۔ جس کا اسلوب بہت دلکش ہے اس میں جذب و شوق کی والہانہ کیفیت بھی ہے اور حسن الفاظ بھی۔ مرثیے کے ارکان و لوازم کے اہتمام نے مرثیہ کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ مطلع یہ ہے:۔

ان نـلـت یـا ریـح الـصبـا یـومـاً الیٰ ارض الـحـرم
بـلـغ سـلامـی روضۃً فیهـا الـنـبـی الـمُـحتـرم

---

[1] اوج: نعت نمبر (جلد اول)، لاہور، گورنمنٹ کالج شاہدرہ، ص ۶۷

[2] ایضاً ص ۷۳

ترجمہ:-

اے بادِ صبا اگر تیرا گزر سرزمینِ حرم تک ہو تو میرا اسلام اس روضہ کو پہنچا دے جس میں نبی محترمؐ تشریف فرما ہیں۔

عہدِ بنوامیّہ اور بنوعبّاس میں بھی مرثیہ گوئی کا یہ سلسلہ جاری رہا اور شعرا نے اپنے ممدوحین کے اوصاف کو بڑھ چڑھا کر بیان کیا۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ میں درج ہے:

"عہدِ عباس میں کسی بڑے سپہ سالار اور قائد عساکر کی موت پر شعرا نے اس کے صبر واستقلال، عزم وہمت اور جرات وشجاعت کے خوب گن گائے اور قوم وملت کے لیے اس کی موت کو جانکاہ صدمہ قرار دیا"۔[۱]

اور مرثیے کی یہ روایات تا حال قائم ہیں۔

---

[۱] اردو دائرہ معارف اسلامیہ: (لاہور، پنجاب یونیورسٹی) جلد ۱۸، ص ۳۹۱

(ج) عربی نعت اور ممدوحِ عالمؐ کی تحسین

اور اب ہم عربی شاعری میں نعت کی طرف آتے ہیں۔نعت پورے عالمی ادب میں اپنی نظیر آپ ہے۔ایک ایسی صنف سخن جو دنیا بھر کے ادب پر چھائی ہوئی ہے۔اور معیار و مقدار کے حوالے سے روز بروز ترقی کر رہی ہے۔اس کی سب سے اہم اور نمایاں خوبی اس کا موضوع ہے جو ایک ہی ہستی،ایک ہی مبارک وجود سے متعلق ہے یعنی حضرت محمدؐ، سرور کائنات جن کی نعت کا شرف سب سے پہلے اس کے خالق کو حاصل ہے۔اس اعتبار سے نعت سراسر منظوم خراجِ عقیدت ہے،کہ یہ شخص مخصوص کی تعریف و توصیف اور مدح پر مبنی ہے۔عربی میں نعت کو مدح النبیؐ کہتے ہیں۔

عربی ادب کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی مداحین نبویؐ کا مشترک موضوع ممدوح پاکؐ کی عالی نسبی، سیرت وشمائل،مکارم اخلاق،حسنِ سلوک و ہمدردی،عفوودرگزر اور آپؐ کے سفر معراج اور معجزات کے بیان کے علاوہ صحابہ کرامؓ کے ایمان و اعتقاد،رسالتِ محمدیؐ کی تصدیق،دشمنان اِسلام کی مذمت و تحقیر،ہدایت بخشی اور دولت ایمان اور نعمت قرآن حاصل کرنے پر تشکر و امتنان اور غزوات میں فتح اسلام اور شکستِ کفار پر مسرت وشادمانی کا اظہار ہے۔سب سے پہلے آنحضرتؐ کے مربّی اور عمِ محترم جناب ابوطالب نے آپؐ کی مدح کا شرف حاصل کیا۔اس قصیدے کے دو اشعار ہیں:[1]

اذاجتمعت یوماً قریش لمفتخر
فعبد مناف سرها وصمیمها
وان فخرت یوماً فان محمداً
هوالمصطفیٰ من سرها وکریمها

ترجمہ:-

جب کبھی قریش کسی جگہ فخر ومباہات کے لیے اکٹھے ہوئے تو عبد مناف ہی قبیلے کی جڑ اور اصل ہیں۔اور اب جب قریش مکہ فخر کے لیے جمع ہوں تو محمدؐ ہی ان میں پسندیدہ مایہ عزت و افتخار ہیں۔

آنحضرتؐ کا دوسرا اہم مداح جاہلیت کا نامور شاعر اعشیٰ بن قیس تھا۔عہد رسالت کے مداحین نبویؐ میں کعب بن زہیرؓ کا نام بہت نمایاں ہے۔جو قبول اسلام کی نیت سے آپؐ کے پاس تشریف لایا اور اپنا مشہور قصیدہ بانت سعاد،آپ کی خدمت میں سنانے کا شرف پایا۔آپؐ نے تعریف فرمائی اور اپنی چادر مبارک اتار کر کعبؓ کو انعام میں عطا فرمائی۔اسی لیے اس کا نام قصیدۂ بردہ پڑ گیا۔روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے اس کے ایک شعر میں تصحیح فرماتے ہوئے''سیوف الہند'' کو''سیوف اللہ'' سے بدل دیا۔شعر ملاحظہ ہو:

---

[1] اردو دائرہ معارف اِسلامیہ (جلد۲۰) : ص۳۹۶

ان الــرســول لسیف لیستــفــائبــه
مهــنــد مــن سیــوف الــلّــه مســلــول

ترجمہ:-

بے شک رسول خدا ایک ایسی تلوار ہیں جن سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔اللہ کی تلواروں میں سے ایک تیز اور بے نیام تلوار۔

ہجرت کے بعد شعرائے قریش نے اسلام اور آنحضورؐ کے خلاف ہجو گوئی کی صوت میں شدید معاندانہ پروپیگنڈا شروع کر دیا تو اس کا جواب دینے کا بیڑا حضرت حسان بن ثابتؓ نے اٹھایا۔اور یوں انھیں شاعرِ اسلام اور شاعر النبیؐ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔[1]

مشرکین مکہ کے ساتھ شعری معرکوں میں جن شعرا نے حضرت حسانؓ کا ہاتھ بٹایا ان میں حضرت عبداللہ بن رواحہ قابل ذکر ہیں۔انھوں نے اپنی قادر الکلامی سے کفار کی دریدہ دہنی کا جواب پیش کیا۔انسائیکلوپیڈیا آف عربیک لٹریچر میں حضرت حسانؓ بن ثابت اور حضرت عبداللہؓ ابن رواحہ کے متعلق یوں درج ہے:

> Hassan Ibn Thabit al-Ansari most prominent of those poets who associated themselves with the prophet Muhammad ...At the time of his conversion to Islam,which took place soon after Hijra, he was already an esteemed poet.The prophet approved of and encouraged the invective against the Un-believers and panegyrice on himself made by Hassan and others such as Abd Allah Ibn Rawaha and Ka'b Ibn Malik[2]

عہد رسالت کے جن دیگر مادحین رسولؐ کا تذکرہ ملتا ہے، ان میں حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب ،حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت علیؓ ابن ابی طالب ،سعدؓ بن ابی وقاص، مالکؓ بن نمطہ، کعبؓ بن مالک ،عباسؓ بن مرداس، اور خواتین میں حضرت صفیہؓ بنت ابی طالب، حضرت عاتکہؓ بنت عبدالمطلب اور سیدہ فاطمۃ الزہراؓ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اس زمانے میں جو نعتیں کہی گئی ہیں ان کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے ان میں تکلف و تصنع، نازک خیالی اور مبالغہ آمیزی کا شائبہ نہیں اور یہ شعرا کے اخلاص، عقیدت اور دلی جذبات کی ترجمان ہیں۔اموی اور عباسی دور کے نعت نگاروں میں الغزالیؒ، القشیریؒ، شہاب الدین سہروردیؒ، ابن عربیؒ جیسے اکابرین کے نام آتے ہیں جن کی نعتیں ہر سال حجاج

---

[1] اوج: (نعت نمبر) جلد دوم۔ص،۲۳۱

[2] *Encyclopedia of Arabic Literature* edited by Julia Scott Meisami and Paul Strakey dge .London and Newyork .Page 275.Vol 1 1998 Roultge

کی زبانی عالمِ اسلام کے کونے کونے میں پہنچ جاتی تھیں۔

ساتویں صدی ہجری میں ایک اور نامور مداحِ نبیؐ امام شرف الدین محمد بن سعید البوصیری کا نام سامنے آتا ہے جن کی شہرت کا اصل ضامن قصیدہ بردہ ہے۔ سارا قصیدہ عشق نبویؐ میں ڈوب کر لکھا گیا ہے اس لیے اسے عالم اسلام میں اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ بطور وظیفہ بھی پڑھا جاتا ہے، اس کا متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ سیکڑوں شعرا نے اس کی زمین میں اپنے قصیدے لکھے۔ ذیل میں اس کے چند مشہور اور خوبصورت ترین اشعار درج کئے جاتے ہیں:۔

محمدٌ سید الکونین والثقلین
والفریقین من عرب ومن عجم
هو الحبیب الذی ترجی شفاعته
لکل هول من الاهوال مقتحم

ترجمہ:۔

محمدؐ دونوں جہانوں، جن وانس، عرب وعجم کے سردار ہیں۔ آپ اللہ کے ایسے حبیب ہیں جن سے خوف ودہشت کے ہر موقع پر سفارش وشفاعت کی جاتی ہے۔[۱]

آٹھویں، نویں اور دسویں صدی ہجری میں عربی زبان وادب پر تکلف وآورد کا رنگ چھا گیا تھا۔ عربی شاعری صنائع وبدائع، رعایت لفظی اور مبالغہ آرائی سے گراں بار ہوگئی اور نعتیہ کلام میں محبت، عقیدت، دل سوزی اور وارفتگی کے جذبات میں کمی آنے لگی۔ البتہ عصرِ حاضر میں احمد شوقی کے نعتیہ کلام نے بڑی شہرت حاصل کی۔ بقول احمد حسن الزیّات:

''وہ ان دس صدیوں کا نعم البدل ہے''۔[۲]

شوقی کا کلام قدیم عربی شاعری کے جملہ محاسن کا حامل ہے۔ اس کے نعتیہ قصائد اپنی فنی اور ادبی خوبیوں کے باعث ادبِ عالی کا شاہکار ہیں۔ عربی زبان وادب کی مندرجہ بالا اصناف کے مختصر تعارف وتاریخ کے مطالعہ اور عربی شاعری میں مدح کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عرب شعرا مدح کے معاملے میں خاصے فراخ دل واقع ہوئے ہیں تاہم ان کی مدح ان افراد واشخاص تک محدود رہتی ہے جن کو وہ اس کا صحیح معنوں میں حقدار سمجھتے ہیں۔ اور جنھیں وہ اپنے ممدوحین کی فہرست میں شامل کر لیتے ہیں تو ان کی مدح کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتے۔ اس طرح عربی ادب کے قارئین کو عربی شاعری میں مدح کے دلکش اشعار سے حظ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔

۱۔ اوج (نعت نمبر) جلد دوم، ص ۲۴۳

۲۔ تاریخ ادب عربی: ص ۵۹۱

(ii) فارسی قصیدے میں شخصی مدح

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ قصیدہ عربوں کی خصوصی صنف ہے۔ فارسی، ترکی اور اردو میں قصیدہ گوئی کا آغاز عربوں کی پیروی سے ہوا اور تشبیب، گریز، مدح، حسنِ طلب اور دعا کے ارکان لازمی قرار دیئے گئے۔ فارسی قصیدہ گوئی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دور متقدمین، متوسطین، اور متاخرین۔ دور متقدمین میں رودکی کا نام سرفہرست ہے۔ جس کے قصیدہ ''پردہ عشاق'' کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ مطلع ملاحظہ ہو:

ع

بوی جوی مولیاں آید ہمی

یادِ یارِ مہرباں آید ہمی[1]

ترجمہ:

مولیان کی ندی کی خوشبو آ رہی ہے اور مہربان محبوب کی یاد بھی۔

غزنوی دور میں علم وادب کا عام رواج ہوا محمود غزنوی نے اپنے دربار میں شاعروں اور ادیبوں کی بڑی عزت افزائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ عنصریؔ، فرخیؔ اور فردوسیؔ جیسے بڑے شاعروں نے اس کی مدح کی ہے۔

عنصریؔ کے اشعار کا بہترین حصہ اس کے قصائد ہیں۔ جن میں اس نے اپنے ممدوحین کے اوصاف ان کی فتوحات اور کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ عنصری قصائد میں بعض ایسے اخلاقی مسائل بھی بیان کرتا ہے۔ جن میں قارئین کے لیے عالی ہمتی، بلند نظری اور وسیع ظرفی کا سبق ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ قصیدہ گو شاعر تھا لیکن اس نے کبھی کسی کی بے جا تعریف نہ کی تملق اور خوشامد سے اس کا دامن داغ دار نہیں، ہنر نمائی کی خاطر مبالغہ کرتے ہوئے وہ حد سے بھی نہیں گذرتا بلکہ حسبِ موقع بادشاہ کی مدح کرتے ہوئے اسے عفو، رحم، سخاوت اور وفا کی تلقین کرتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ مجھے دنیا میں دو چیزیں دے کر بھیجا گیا:۔

مرا بہر دو چیز آمد ز گیتی

دل پاک و زبان مدح گستر

یکی بر مہر جاناں وقف کردم

یکی بر مدح شاہنشاہِ کشور[2]

ترجمہ:-

میں اس دنیا میں دو چیزیں لے کر آیا۔ پاک دل اور تعریف کرنے والی زبان۔ ایک کو میں نے محبوب کی محبت کے لیے وقف کر دیا اور دوسری کو شہنشاہِ کشور کی مدح کے لیے۔

---

[1] نظامی عروضی سمرقندی: چہار مقالہ (لائیڈن طبع محمد قزوینی، ۱۳۲۶ء) ص ۵۶

[2] اشرف لطفی (مرتب): مطالعہ ادبیات ایران (لاہور، تاج بکڈپو، ۱۹۶۶ء) ص ۳۲

عنصریؔ کو اس کے ہم عصر شاعروں نے بھی سراہا اور اپنے قصائد میں خراج تحسین پیش کیا۔ مثلاً منوچہریؔ جو خود بھی اساتذۂ شعر میں شمار ہوتا ہے اور اس کے قصائد، عرب قصائد کی یاد دلاتے ہیں عنصریؔ کی تعریف میں یوں گویا ہے:

اوستاد اوستادانِ زمانہ عنصری
عنصرش بی عیب و دل بی غش و دینش بی فتن[۱]

ترجمہ:-

زمانہ کے استادوں کا استاد عنصری ہے جس کا وجود بے عیب، دل بے کدورت اور دین فتنہ سے پاک ہے۔

فرخیؔ بھی دربار غزنوی سے بڑا عرصہ مربوط رہا اس کے قصائد کا بڑا حصہ دربار غزنہ کی مدح میں ہے۔ فرخیؔ نے اپنے زمانے کے سبکِ مدح میں اپنے ممدوح کو بلند اوصاف اور پاکیزہ اخلاق بخشے۔ اس کا ممدوح سخن فہم، سخنور اور انسانیت نواز ہے۔ اس کا مذہب جود و سخا ہے وہ اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے حق پرست، دیندار اور سچا ہے۔ سلجوقی دور میں امیر معزیؔ کے قصائد بہت مقبول ہوئے اور اسے ملک الشعراء کا لقب ملا۔ ۵۱ھ میں غزنی فتح ہوا تو معزی نے قصیدہ کہہ کر پیش کیا۔ سلطان سنجر خوش ہوا اور حکم دیا کہ اس کا منہ موتیوں سے بھر دو۔ وہ خود کہتا ہے:

کردم اندر فتح غزنیں ساحری در شاعری
کرد پر گوہر دہانم بادشاہ گوہری[۲]

ترجمہ:-

میں نے فتح غزنی میں شعر میں ساحری کی اور موتیوں کے بادشاہ نے میرا منہ موتیوں سے بھر دیا۔

قصیدہ نگاری کے دورِ متوسطین میں انوریؔ، خاقانیؔ اور قاآنیؔ جیسے بلند پایہ نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن کے قصائد نے فارسی دنیا میں اپنے عہد میں دھوم مچا رکھی تھی۔ اس کا اہم ترین سبب سلاطین قصیدہ نگاروں کی سرکاری سرپرستی تھی۔ جو خوش ہو کر قصیدہ نگاروں پر انعام و اکرام کی بارش کر دیتے تھے اور انھیں سونے چاندی میں تلوا دیتے تھے۔ بہر طور فارسی شاعری پر ایک دور ایسا بھی آیا جس میں قصیدہ نگاران اور قصائد مفقود ہو گئے یہ دور ہنگامہ تاتار کا تھا۔ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

''ہنگامہ تاتار نے دفعتہً وہ سارا دفتر ابتر کر دیا ممدوح نہ رہے تو مدح خواں کہاں سے آتے''۔[۳]

---

۱ اشرف لطفی (مرتب): مطالعہ ادبیات ایران، ص۳۲

۲ قاضی فضلِ حق: سنحنوران ایران (لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۹ء) ص۹۷

۳ شعر العجم (حصہ پنجم) ص۱۳

اس بحران کے بعد صفوی دور میں محتشم کاشی، عرفی اور پھر اکبری دور کے شعراء میں طالب آملی، قدسی اور قاآنی نظر آتے ہیں، جن کے قصائد قدما کی طرز پر لکھے گئے تاہم اس دور کی قصیدہ نگاری میں الفاظ کی شان وشوکت کے ساتھ مضامین کی جدت اور واقعہ نگاری بھی ملتی ہے۔ صفوی دور کے شاہان کے زیر اثر فارسی شاعری پر مذہب کا گہرا اثر ملتا ہے۔ اور شعرا کے مدحیہ قصائد میں مبالغہ آرائی کم سے کم ہوتی چلی گئی۔ رضا زادہ شفق لکھتے ہیں:

''صفویان تشیع را مذہب رسمی قرار دادند، ازین رو نظم ونثر مذہبی درین عصر ترقی کرد، شعرا بجائے مدحِ شاہان بہ نعت انبیا و اولیا پرداختند و مدحِ آل رسولؑ را موضوع قرار داد۔''[۱]

اور جب قصیدے کا رخ دنیوی حرص وہوا سے ہٹ گیا تو ایران کے اکثر یتی قصیدہ گو شاعروں نے ہندوستان کا رخ کیا جہاں تہذیب وتمدن کے اعتبار سے مغلیہ سلطنت اپنے عروج پر تھی اور مغل شہنشاہ ان شعرا کی سرکاری سرپرستی کرنے لگے۔

---

[۱] رضازادہ شفق: تاریخ ادبیاتِ ایران (تہران، ۱۳۴۲ھ) ص ۲۶۳

(ب) فارسی مرثیے میں تحسین مِمدوحین

فارسی مرثیہ کی روایات عربی مرثیہ سے فارسی شاعری میں آئی ہیں۔ تاریخی اور ادبی شواہد کے مطابق ظہور اسلام کے بعد ہمیں سب سے پہلے ایران میں فارسی مرثیے کی پہلی صورت شخصی مرثیہ کی صورت میں سامانی دور میں دکھائی دیتی ہے۔

سامانی دور میں فارسی کے پہلے شاعر رودکی نے اپنے ہم عصر شاعر ابوالحسن شہید بلخی کی موت پر شخصی مرثیہ کہا جس کا مطلع ہے:۔

کاروان شہید رفت از پیش
زآن ما رفتہ گیر و می اندیش[۱]

شخصی مرثیہ ہمیں بعد کے ادوار میں سے غزنوی دور میں فردوسی کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ فردوسی نے اپنے بیٹے کی وفات پر مرثیہ کہا جس کا عنوان یہ ہے:۔

ع زاری فردوسی از مردن فرزندِ خویش

فرخی بھی غزنوی دور کا اہم مرثیہ نگار شاعر تھا۔ فردوسی کے مذکورہ بالا مرثیے سے قطع نظر کرتے ہوئے ہمیں اس دور میں مرثیے کم ملتے ہیں اور جو لکھے گئے ان میں سوز و گداز نام کو نہیں۔ فرخی نے محمود غزنوی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا اس میں محبّ کے سوگوار احساسات کی پوری پوری تصویر موجود ہے۔ اس کے ساتھ طرز ادا اس قدر اثر انگیز ہے کہ پتھر کا دل پسیج جاتا ہے۔ فرخی کہتے ہیں:۔

شہرِ غزنیں نہ ہماں است کہ من دیدم پار
چہ فتاد است کہ امسال دگرگوں شدہ کار
خیز شاہا کہ رسولانِ شہاں آمدہ اند
ہدیہ ہا دارند آوردہ فراواں و نثار
خفتن بسیار ای خواجہ خوی تو نبود
ہیچ کس خفتہ ندیدہ است ترا زین کردار[۲]

۱۔ مقبول بیگ بدخشانی: ادب نامۂ ایران ،(لاہور، یونیورسٹی بک شاپ، س،ن) ص ۹۸
۲۔ ایضاً ص ۔۱۴

ترجمہ:-

(i) شہرغزنی ویسانہیں ہے۔جیسا میں نے گذشتہ سال دیکھا تھااس پر کیاافتاد پڑی جو یہ تباہ ہوگیا۔

(ii) اٹھ اے بادشاہ دیکھ کہ بادشاہوں کے سفیر تیرے لیے نثار کرنے کو ڈھیروں تحائف لائے ہیں۔

(iii) اے آقا تجھے تو اتنا سونے کی عادت ہی نہیں تھی کسی نے تجھے اس طرح کبھی سوتے نہیں دیکھا۔

شخصی مرثیے کی ایک اور خوبصورت مثال ہمیں برصغیر کے نامور شاعر امیر خسرؔو کے ہاں ملتی ہے۔ امیر خسرو نے غیاث الدین بلبن کے فرزند شہزادہ محمد کی وفات پر (جو مغول کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا تھا) ایک مرثیہ کہا۔ اس مرثیے کو لوگ مہینوں تک پڑھتے رہے۔ اس کا مطلع ہے:۔

واقعہ است این یا بلا از آسماں آمد پدید

آفت است این یا قیامت در جہاں آمد پدید[1]

ترجمہ:-

یہ واقعہ ہے یا آسمان سے بلا ظاہر ہوئی ہے۔ یہ آفت ہے یا دنیا میں میں قیامت بپا ہوئی ہے۔

فارسی شاعری میں مرثیے کی دوسری قسم قومی یا اجتماعی مرثیوں کی ہے اور فارسی شاعری میں اس کی بہت خوبصورت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً مسعود سعد سلمان نے اپنے مولد لاہور سے دور قلعہ نای میں اپنے وطن کی یاد میں ایک دردناک مرثیہ کہا، اسی طرح خاقانؔی نے ایوانِ مدائن کی کھنڈرات دیکھے تو ایک بڑا پرسوز اور غم ناک قصیدہ کہا۔ اس قصیدے میں ایک قوم کی عظمت کے تباہ حال کھنڈروں پر المناک شعر کہے ہیں۔ اس مشہور مرثیے کا آغاز یوں ہوتا ہے:۔

ہان ای دل عبرت بین از دیدہ نظر کن ہان

ایوانِ مدائن را آئینہ عبرت دان[2]

ترجمہ:-

اے عبرت دیکھنے والے دل اپنی آنکھوں سے ایوائن مدائن کو آئینہ عبرت بنا ہوا دیکھ۔

انورؔی نے ''اشک ہای خراسان'' کے عنوان سے ایک قصیدہ کہا جس میں اس نے اہل خراسان کی نمائندگی کرتے ہوئے فریاد نامہ منظوم کیا شیخ سعدؔی نے جو مرثیہ خلیفہ مستعصم باللہ کے زوال کے بارے میں لکھا ہے اس کا درد

---

[1] ادب نامۂ ایران ، ص۴۹۱

[2] اردو دائرہ معارف اِسلامیہ، جلد۱۸ص۳۹۴

ناک اندازِ بیان، قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ادبیاتِ ایران کی تاریخ شاہد ہے کہ جب شاہ اسمٰعیل صفوی نے صفوی خاندان کی بنیاد رکھی تو اس نے شعیہ مذہب کو سرکاری مذہب قرار دینے کا اعلان کیا۔ اہلِ تشیع کے عقیدے کے مطابق صفوی بادشاہوں نے اپنے قصائد کہلوانے کے بجائے حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے واقعات پرسوز انداز میں کہنے کی ترغیب دی، ایران کے بہترین قصیدہ گو اور غزل گو سرزمین ایران کو الوداع کہہ کر برعظیم پاک و ہند چلے گئے لیکن ایران میں صفوی دربار میں مذہبی مرثیہ نگاری کی بنیاد رکھی گئی جس کی رو سے مرثیہ گو شعرا کا ایک جم غفیر معرض وجود میں آیا اس طرح ایران میں مذہبی مرثیہ نگاری کا آغاز ہوا۔ اس دور و مابعد کے نمایاں ترین مرثیہ نگاروں میں محتشم کاشی اور حکیم قآنی شامل ہیں۔ عہدِ قاچاریہ کے حکیم قآنی نے مرثیہ نئے انداز میں لکھا۔

انھوں نے مرثیہ میں سوال جواب کا طریقہ اختیار کیا۔ لکھتے ہیں:۔

ع نامش چہ بد ؟ حسینؓ زنژاد کہ ؟ زعلیؓ
مادر کہ بود ؟ فاطمہؓ جدش کہ ؟ مصطفیٰؐ
چہ شد ؟ شہید شد بکجا؟ دشتِ ماریہ
کے ؟ عاشر محرمؑ پنہان؟ نہ برملا
مظلوم شد شہید ؟ بلی جرم داشت ؟ نہ
کارش چہ بُد ؟ ہدایہ ویارش کہ بُد ؟ خدا[1]

مذہبی مرثیہ کی یہ روایات ایران کی سرزمین سے نکل کر برعظیم پاک و ہند کی ادبیات میں داخل ہو گئیں اور اہل بیت کا مرثیہ خصوصیت سے اردو شاعری کا حصہ بن گیا۔

---

[1] حامد حسن قادری: تاریخ مرثیہ گوئی (دہلی، ہمالیہ بک ہاؤس، ۱۹۷۳ء) ص ۱۴

(ج) فارسی نعت اور ممدوح عالمؐ کی عیش

فارسی مرثیہ کی طرح فارسی نعت کا ماٗخذ بھی عربی نعت ہے حضور اکرمؐ کے معاصر شعرا کعبؓ بن زہیر، حسانؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن رواحہ اور مابعد کے شعرا میں سے البوصیری وغیرہ کی نعتوں کی گونج ایران پہنچی تو وہاں کے شعرا کے دلوں میں بھی ارتعاش پیدا ہوا۔ شروع میں ایرانی شعرا الگ نعت لکھنے کے بجائے اپنے قصائد کی ابتدا نعتیہ اشعار سے کرنے لگے۔ یہ گویا ایران میں نعت گوئی کا عبوری دور تھا جس میں عرب شعرا کی تقلید کی گئی۔ اس دور میں شعرا کے کلام میں نعتیہ سرمایہ کی مقدار کم ملتی ہے اور ابو عبداللہ رودکیؔ، فردوسیؔ، اسدی طوسیؔ اور کسائی مروزیؔ ایسے ہی شعرا کی صف میں شامل ہیں۔ دور غزنوی کے معروف شاعر مسعود سعد سلمانؔ کے دیوان میں ایک خوبصورت نعتیہ رباعی ملتی ہے:

آن زبانی کہ مدح شاہان گفت
مادحِ حضرتِ خداست کنون
لہجہ پر نوای خوش نعمت
بلبل باغِ مصطفیٰ ست کنون[1]

ترجمہ:-

وہ زبان جو بادشاہوں کی مدح کرتی رہی اب خدا کی مدح گو ہے اور اب وہ حضورؐ کے باغ کی خوش گلو بلبل ہے۔

ابتدا میں فارسی کی نعتیہ شاعری ہمیں کبھی قصائد کی زینت دکھائی دیتی ہے اور کبھی مثنویات میں اپنی بہار دکھلاتی ہے۔ خاقانیؔ، نظامیؔ، سنائیؔ، کے قصائد اور مثنویات میں جستہ جستہ اشعار مدحِ نبیؐ کے ملتے ہیں۔

مولانا جلال الدین رومیؔ نے جن کی زندہ و جاوید یادگاریں "مثنوی معنوی" اور "دیوانِ شمس تبریز" جنہیں عرفان و تصوف کا خزینہ کہا جا سکتا ہے، براہِ راست نعت کے عنوان سے کوئی نظم نہیں کہی۔ لیکن مثنوی کے ہر دفتر اور دفتر کے ہر باب میں حضور اکرمؐ کی ذات و صفات اور تعلیمات کے متعلق جہاں موقع ملا ہے۔ اظہار خیال کر کے خلوص و عقیدت کے نذرانے پیش کیے ہیں۔

عراقیؔ کے کلام میں با قاعدہ ۲۹ اشعار پر مشتمل نعت ملتی ہے۔ سعدیؔ، جن کے سرمایۂ شعر کو جاودانی حیثیت حاصل ہے۔ ان کی بوستان میں جو نعت ملتی ہے اس میں آنحضورؐ سے محبت اور ان کے احترام کا یہ عالم ہے کہ اس میں آپؐ

---

[1] اوج (نعت نمبر) جلد اول، ص ۵۳۴

کا اسمِ مبارک استعمال کرنے کی بجائے آپؐ کے اسمائے ذات وصفات استعمال کئے ہیں۔ کہتے ہیں۔

ترا عزِّ لولاک تمکیں بس است
ثنائے تو طٰہٰ و یٰسین بس است
چہ وصفت کند سعدیؔ نا تمام
علیک الصلوٰۃ اے نبیؐ و السلام[1]

ترجمہ:-

آپؐ کو بطور مرتبہ لولاک کی عزت کافی ہے۔ آپ کی تعریف تو لفظ طٰہٰ ویٰسین سے ہوسکتی ہے۔ ناقص سعدیؔ آپ کی کیا تعریف کرے آپ پر اے نبیؐ درود وسلام۔

امیر خسروؔ نے اپنی ہر مثنوی کی ابتدا نعت اور حمد باریٔ تعالیٰ سے کی۔ انھوں نے نعت میں معراجِ نبوی کی کیفیات بڑی مفصل اور والہانہ انداز میں بیان کی ہیں۔ بعد کے ادوار میں فارسی شاعری کے نعت گو شعرا میں خواجو کرمانیؔ، سلمان ساوجیؔ، جامیؔ، فیضیؔ اور عرفیؔ کی بہت خوبصورت اور دلکش نعتیہ شاعری ملتی ہے۔ ان نعتوں میں حضورؐ کی سیرت اور عبادات کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ پیارے نبیؐ کے ظاہری حسن و جمال کی مدح کے ساتھ ساتھ یہ نعتیں وارداتِ قلبی کی ترجمان ہیں اور ان میں شعرا کی سید المرسلینؐ سے محبت، شیفتگی اور عقیدت حرف حرف میں جھلکتی ہے۔

عربی اور فارسی شاعری کی تین بنیادی اصناف قصیدہ، مرثیہ اور نعت کے مطالعے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عربی اور فارسی شاعری کی ان اصناف میں ہمیں شخصی یا ذاتی تحسین وتعریف کے خوبصورت نمونے ملتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ کبھی یہ تعریف ہمیں کسی عظیم ہستی کی موت پر کسی دلگداز مرثیہ میں نظر آتی ہے اور شاعر اسے نقصانِ عظیم قرار دیتا ہے۔ اور کبھی تحسین کے یہ انداز ہمیں کسی زندہ، بلند کردار کے حامل، عالی مرتبت شہنشاہ کے قصیدے میں دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں شعرائے فارسی بالخصوص اس کی ذات میں موجود صفات کی تحسین کے ساتھ ساتھ دیگر اخلاقی خوبیوں اور صفات کو اپنانے کی تلقین کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک عربی میں مدح النبیؐ اور فارسی نعت کا تعلق ہے وہاں ہمیں مدح و تحسین کے نہایت اعلیٰ نمونے ملتے ہیں جو شعرا کے حضور اکرمؐ کے ساتھ عشق وعقیدت کا بھرپور اظہار ہیں۔ اس نعتیہ سرمایے میں پیارے نبیؐ کی ذات وصفات بڑے جذب وشوق اور والہانہ پن میں بیان کی گئی ہیں۔ گویا اس طرح ہم نعت کی صنف میں بھی شخصی یا ذاتی تحسین سے متعارف ہوتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ عربی اور فارسی شاعری میں مدح وتحسین کی یہ خوبصورت مثالیں آگے چل کر اردو شاعری میں منظوم خراجِ عقیدت کی بنیاد بنتی دکھائی دیتی ہیں اور اسی وجہ سے اردو کا دامن اظہارِ تحسین سے آشنا ہوتا ہے۔

---

[1] فضل الرحمٰن (شارح): بہار بوستان سعدی (ملتان، مکتبہ شرکتِ علیم، ۱۴۰۰ھ) ص ۲۵

فصل دوّم:

اردو شاعری میں منظوم خراج عقیدت کی روایت، اصنافِ شعر کی روشنی میں

اردو شاعری کا وسیع دامن رنگارنگ اصنافِ سخن سے مزین ہے۔ بالخصوص اصناف شعر میں کہیں ہمیں تغزل کی پر بہار وادیاں نظر آتی ہیں اور کہیں سنگاخ زمینوں کے قصائد اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ شان وشوکت کے مینار بنے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں دلفریب کہانیاں منظوم مثنویات کی صورت قاری کی توجہ کھینچ لیتی ہیں اور کہیں دلِ مسلم سرور کائنات کے عشق سے سرشار، آپؐ کی مدح کرتا ہے، اور آپؐ اور صحابہ کرامؓ کے حضور بے ساختہ سلام عرض کرتا ہے۔

(ا) اردو قصیدے میں شخصی تحسین کے آثار:

غرض اردو شاعری کی تقریباً ہر صنف سخن میں ہمیں منظوم خراجِ عقیدت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ذیل میں ہم سب سے پہلے صنف قصیدہ سے بحث کرتے ہیں۔

اموی اور عباسی ادوار میں سندھ اور ملتان میں قائم ہونے والی مسلم حکومتیں اپنے ہمراہ اس عہد کی زرخیز ترین زبان عربی کا اثاثہ لائیں۔ غزنویوں، غوریوں اور خاندانِ غلاماں سے لے کر تغلقوں اور پھر لودھیوں کے عہد کی مستحکم حکومتوں نے فارسی زبان کو ذریعہ ابلاغ بنایا اور تقریباً تین سو سال تک فارسی کو علمی وادبی اور سرکاری زبان کی حیثیت حاصل رہی۔ اس لیے ہندوستان میں ہر کہ ومہہ کو فارسی زبان وادب سے حسبِ توفیق تعلق اور مناسبت ہوتی تھی۔

دیگر اصنافِ سخن کی مانند قصیدے کی بھی ابتدا دکن میں ہوئی اور اولین صاحب دیوان قصیدہ نگار کے طور پر ہمارے سامنے نظامی کا نام آتا ہے۔ وہ احمد شاہ ثالث کی مدح میں لکھتا ہے:

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار
پرت پال، سیتار، کرتار، آدھار[1]

اردو کی ابتدائی شاعری کے قصیدہ نگاروں میں محمد قلی قطب شاہ اور عادل شاہی دور میں نصرتیؔ اور شاہیؔ کے یہاں بھی اچھے قصائد ملتے ہیں۔ مگر نمایاں ترین قصیدہ گو کے طور پر ولیؔ دکنی کا نام نمایاں ہے۔ ولیؔ کے قصائد کا موضوعاتی دائرہ نعت ومنقبت ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قلی قطب شاہ سے ولیؔ تک اور ولیؔ کے دور کے دیگر شعرا میں جنہوں نے قصائد کہے ان میں کوئی نمایاں جدت نظر نہیں آتی۔ حاتمؔ اور آرزوؔ کے دور میں بھی قصیدے نے کوئی خاص ترقی نہ کی اتنا

---

[1] جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو (جلد اول) (لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء) ص ۱۶۳

پھر بھی کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ بالا شعرا قصیدے کے ابتدائی شاعر ہیں فنی اعتبار سے اردو قصیدہ نگاری ہمیں میر و سودا کے دور میں عروج پر نظر آتی ہے۔ مرزا رفیع اللہ سوداؔ نے ۴۱ قصائد کہے اور ان کے ممدوحین کی بھی ایک بڑی تعداد ہمارے سامنے ہے۔ سوداؔ نے اردو قصیدے کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا۔ قصیدے میں سوداؔ کے موضوعات متنوع ہیں اگر ایک طرف بزرگان دین کی مدح ہے تو دوسری جانب اہل دول کی تعریف ہے۔ ایک طرف واقعات کی نقش گری ہے تو دوسری طرف ہجو کی نشتریت۔ سوداؔ کے قصائد میں مدح روایتی ہے اور ممدوح کے اوصافِ حسنہ کے ساتھ ساتھ گھوڑے، تلوار اور ہاتھی وغیرہ کی تعریف بھی ملتی ہے۔ اس اعتبار سے سوداؔ، عربی و فارسی قصائد کی روایت کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سودا قصائد میں رسول اکرمؐ، حضرت علیؓ اور امام حسینؓ کی بھی مدح و منقبت کرتے ہیں: ؎

؎ شیر یزدان، شہہ مردان علیؓ عالی قدر
وصی ختم الرسل اور امامِ اول [۱]

سودا کے بعد دوسرے بڑے قصیدہ گو میر انشاؔ ہیں۔ انشاء اللہ خان انشاؔء کے قصائد میں علم و فضل اور اصطلاحات علمی کی بھرمار ہے۔ انشاؔ کے قصائد اپنے دور کے نوابین اور انگریز سرکار کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ انشاؔ کے بعد ذوقؔ کے قصائد بھی ان کی علمیت کے اظہار سے بھرپور تھے اور انھیں بہادر شاہ ظفر کی طرف سے خاقانی ہند کا خطاب عطا ہوا۔ ذوقؔ کو بہادر شاہ ظفر کی مدح میں کہے جانے والے قصیدے پر پورا گاؤں جاگیر میں عطا ہوا تھا۔ اس قصیدے کے چند اشعار مدحیہ ملاحظہ ہوں: ؎

تیرا دروازۂ دولت ہے مقامِ امید
تیرا دیوانِ عدالت ہے محل عبرت
ذہن، عالی ہے ترا طائر شاخِ سدرہ
طبع رنگین تری گلچیں ریاض جنت
عقل میں شمس ہے تو علم میں کانِ گوہر
فضل میں کعبہ ہے تو حلم میں کوہ رحمت [۲]

اس دور کے دوسرے بڑے شعرا مومنؔ و غالبؔ نے بھی قصیدے لکھے مگر مومنؔ کی طبیعت قصیدے سے مناسبت نہ رکھتی تھی۔ غالبؔ البتہ جدت پسند تھے اور انھوں نے قصائد میں اپنا انفرادی رنگ برقرار رکھا۔ ان کے مروجہ دیوان میں اردو کے صرف تین قصیدے ہیں۔ حضرت علیؓ کی منقبت میں ان کا قصیدہ ہے: ؎

---

[۱] مرتضیٰ جعفری، سید (مرتب): منتخب قصیدے (پشاور، عظیم پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۸) ص ۶۶
[۲] ایضاً ص ۹۳

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں[۱]

ان کا دوسرا قصیدہ بہادر شاہ کی مدح میں ہے: ۔

ہاں مہ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام[۲]

مذکورہ قصیدہ اپنے مضامین اور جدّت کے اعتبار سے بے مثال قصیدہ ہے۔ نمونہ کے طور پر گریز کے آخری اور مدح کے چند ابتدائی اشعار دیکھیے: ۔

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ
اے پری چہرہ پیک تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن
نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف
نو بہارِ حدیقۂ اسلام[۳]

غالبؔ بڑی خوبصورتی اور کمال مہارت سے گریز کرتے ہوئے مدح کی طرف آئے ہیں اور ایک بادشاہ کے حسبِ مرتبہ عالی شان الفاظ وتراکیب میں اسے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ غالبؔ کے بعد قصیدہ نگاری کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔ بعد کے قصیدہ نگاروں میں گرامیؔ اور محسنؔ کاکوروی کے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اور قصائد میں نعتیہ انداز غالب ہے۔

مختصر یہ کہ اگرچہ اردو کے قصائد، معیار و مقدار کے حوالے سے عربی و فارسی شاعری کے ہم پلہ قرار نہیں دیے جا سکتے۔ تاہم یہ قصائد اپنے اندر برعظیم پاک و ہند کی تاریخ لیے ہوئے ہیں اور ہمیں ان میں برعظیم کی ان نامور شخصیات کی صفات اور خوبیاں ملتی ہیں جنہیں اردو شعرا نے منظوم کیا۔

۱۔ مرزا غالب: دیوانِ غالب، مرتب حامد علی خان (لاہور، الفیصل، ۱۹۹۵ء) ص ۱۹۱

۲۔ ایضاً۔ ص ۱۹۴

۳۔ ایضاً۔ ص ۱۹۶

(ب) اردو میں شخصی مرثیہ

اردو شاعری میں مرثیہ کی روایت بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ قصیدے کی۔ عربی کی فخریہ شاعری کی ایک شاخ مرثیہ نگاری تھی۔ ان مراثی میں عرب شاعر تازہ حادثات واقعات کو دلی جوش کے ساتھ لکھتے تھے۔ اس لیے ان کو ان نظموں پر غور وفکر، خیالی آرائی، اور مضمون آفرینی کا نہ وقت وموقع تھا اور نہ ضرورت واقتضائے حال۔ وہ تو بس اپنے دردوغم اور صدمے کا اظہار کرتے تھے اور مرنے والے کے اوصاف گناتے تھے اور ان پر فخر وناز کرتے تھے۔ عرب کے مرثیوں کی سادگی، خلوص اور تاثیر پر یہ قول صادق آتا ہے کہ ع از دل خیزد و بر دل ریزد۔

جب ہم فارسی مرثیے پر نظر دوڑاتے ہیں تو فارسی مرثیہ ہمیں تین اقسام میں بٹا ملتا ہے۔ (ا) شخصی (ب) قومی (ج) اہل بیت کا مرثیہ۔ یہی روایت ہمیں اردو مرثیے میں بھی ملتی ہے۔ یہاں ہم صرف شخصی مرثیہ کو زیر بحث لائیں گے۔ اس لیے کہ موضوع مقالہ کا تعلق نسبتاً مرثیہ کی اس شاخ سے زیادہ ہے۔ اور شخصی مرثیوں میں ہمیں شخص مخصوص کے محاسن اور کارناموں پر تفصیل ملتی ہے۔

جہاں تک شخصی مرثیوں کا تعلق ہے اردو شاعری کی ابتدا ہی میں ذاتی مرثیوں کی خاصی تعداد ملتی ہے۔ ذیل میں سب کا احاطہ کرنا مشکل ہے، یہاں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے عبدالحی تاباںؔ کے دیوان میں ان کے استاد حشمتؔ کا مرثیہ ملتا ہے۔ تاباںؔ جب عین عالمِ جوانی میں فوت ہوئے تو میر تقی میرؔ نے بھی اپنے غم کا اظہار اپنی ایک غزل کے مقطع میں کیا، جو محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں درج کیا ہے: ؂

داغ ہے تاباں علیہ الرحمتہ کا چھاتی پہ میرؔ
ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا[1]

لیکن دردوغم سے لبریز مرثیے ہمیں خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے ہاں نظر آتے ہیں۔ جن میں حالیؔ کی طبیعت کا سوز وگداز بھی جھلکتا ہے۔ حالیؔ کے ہاں دو مرثیے بہت باکمال ہیں، ایک مرزا غالبؔ پر اور دوسرا اپنے دوست حکیم محمود خان کی وفات پر۔ مرزا غالبؔ کے مرثیے میں لکھتے ہیں: ؂

---

[1] محمد حسین آزاد: آبِ حیات (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۷ء) ص ۱۴۰

رشکِ عرفی وفخر طالب مرد	اسد اللہ خان غالب مرد
بلبلِ ہند مرگیا ہیہات	جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس	پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا	شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا[۱]

اس مرثیے کے ایک ایک شعر میں تلخی پائی جاتی ہے اسی طرح مرزا غالبؔ نے دو شخصی مرثیے لکھے اور دونوں بہت حسین اسلوب اور درد و غم کے حامل ہیں۔ ایک مرثیہ اپنے بھانجے زین العابدین خان عارفؔ اور دوسرا محبوبۂ دلنواز کی یاد میں لکھا۔ عارفؔ کے مرثیے میں کہتے ہیں:۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے
پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور[۲]

حفیظؔ جالندھری کے کلام میں بھی شخصی مرثیوں کی کافی مثالیں ملتی ہیں والدہ ماجدہ کے مرثیے کے علاوہ اپنے استاد گرامی کی وفات، اور مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر بھی بڑے اثر انگیز مرثیے لکھے ہیں۔ گرامیؔ کے مرثیے میں لکھتے ہیں:۔

ہو گئے خاموش ہنگامے تری آواز کے
اب نہ چھیڑے گا مغنی تار تیرے ساز کے
سوئے میٹھی نیند شور انگیز افسانے ترے
اٹھ گیا پیرِ مغاں خالی ہیں پیمانے ترے
اب تخیل میں بھرے گا زندگی کے رنگ کون
شعلہ بن کر آپ ہو جائے گا زیبِ سنگ کون[۳]

ان شعرا کی طرح اقبالؔ نے بھی بلند پایہ اور نہایت درد انگیز مرثیے لکھے۔ چند شاہکار مرثیے جو اس نے لکھے وہ یہ ہیں: داغؔ، سوامی رام تیرتھ، فاطمہ بنت عبداللہ، شبلیؔ و حالیؔ، والدہ محترمہ کی یاد میں، ہمایوںؔ، راس مسعود، اور اکبرؔ الہٰ آبادی۔ مذکورہ بالا تمام مرثیے اردو میں لکھے گئے، سوائے اکبرؔ کے مرثیے کے جو بزبان فارسی ہے۔

والدہ مرحومہ کی یاد میں انھوں نے جو طویل نظم لکھی ہے اس میں انھوں نے فلسفی ہونے کی بنا پر اپنے ماتم کو ماتمِ عالم بنادیا ہے:۔

---

۱ خواجہ الطاف حسین حالی: دیوانِ حالی (لاہور، میرزا برادر پبلشرز، ۱۹۴۵ء) ص۲۱۶۔۲۱۷

۲ دیوانِ غالب: ص۱۱۳

۳ حفیظ جالندھری: سوز و ساز (لاہور، کتب خانہ حفیظ، س،ن) ص۱۴۴
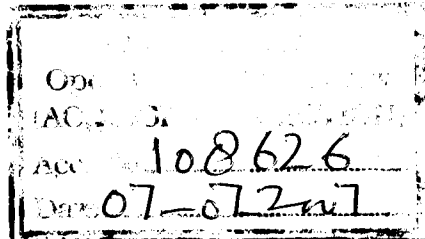
؎ جو ہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں
رختِ ہستی خاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے[۱]

خود اقبالؔ کی وفات پر سیکڑوں مراثی لکھے گئے اور ان مراثی اور نظموں پر مشتمل کئی مجموعے بھی مرتب کیے گئے۔ مختصراً شخصی مرثیہ نگاری کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے کیونکہ فنا، بقا کے ساتھ ساتھ ہے اور فنا کے ساتھ اظہارِ غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

۱؎ علامہ اقبال: کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۲۴۸

(ج) اردو نعت اور تحسین ممدوح عالم

اردو شاعری کو یہ اعزاز و افتخار حاصل ہے کہ یہ اپنی پیدائش کے وقت ہی سے مومن اور کلمہ گو رہی ہے۔ اور عموماً ہر دیوانِ شعری کا آغاز حمد و نعتِ نبیؐ سے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم شعرا بھی اس روایت پر عمل پیرا رہے ہیں۔ اردو کی ابتدائی نعتیہ شاعری جو دکن سے شروع ہوئی اس پر دکنی اور گجری لب و لہجہ نمایاں ہے۔ جو قاری کو نامانوس لگتا ہے، تاہم اردو نعت کا باقاعدہ آغاز قلی قطب شاہ نے کیا۔ دکن کے تمام نمایاں شعرا مثلاً ملا وجہی، غواصی، نشاطی، نصرتی، بلاقی وغیرہ سبھی نے نعتیہ شاعری کی ہے۔ بارھویں صدی میں ولی دکن کا نعتیہ کلام اردو نعت کے ارتقائی سفر میں ایک نئی منزل کی نشان دہی کرتا ہے۔ ولی کا نعتیہ سرمایہ، جو غزل اور قصیدے سے لے کر رباعی، مخمس، مسدس اور مستزاد پر مشتمل ہے اور ان کے مخصوص رنگ کی ترجمانی کرتا ہے۔ ولی کہتے ہیں:

یا محمد دو جہاں کی عید ہے تج ذات سوں
خلق کوں لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے[۱]

میر و سودا کے دور میں سودا کے نعتیہ قصائد کو اردو کی باضابطہ نعتیہ شاعری کا ابتدائی نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ ان کے نعتیہ قصیدے کا مطلع ہے:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زنارِ تسبیحِ سلیمانی[۲]

زورِ بلاغت سے لبریز اس قصیدے میں سودا کے داخلی احساسات کی جھلکیاں ملتی ہیں:

ہزار افسوس اے دل ہم نہ تھے اس وقت دنیا میں
وگر نہ کرتے یہ آنکھیں جمال اس کے سے نورانی
بس آگے مت چل اے سودا میں دیکھا فہم کو تیری
کر استغفار اس منہ سے اب ایسے کر ثنا خوانی[۳]

اردو نعت نے مستقل فن کی حیثیت تیرھویں صدی ہجری میں اختیار کی اور اسے باقاعدہ فن بنانے والوں کے ہراول دستے میں شمالی ہند کے کفایت علی کافی، غلام امام شہید، حافظ لطف بریلوی وغیرہ معروف ہیں۔ لطف بریلوی غزل

۱۔ ریاض مجید، ڈاکٹر: اردو میں نعت گوئی (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء) ص ۲۳

۲۔ عبدالباری آسی (مرتب): کلیات سودا (لکھنؤ، نول کشور، ۱۹۳۲ء) ص ۱۲۰

۳۔ ایضاً ص ۲۲

میں نعت نگاری کے سب سے پہلے شاعر ہیں۔انھوں نے غزل کی صنف کو نعت کے لیے مخصوص کر کے نعت گوئی کے وسیع امکانات دریافت کیے۔ان شعراء نے نعت رسولؐ کا انداز بلند کر دیا اور آنے والوں کے لیے ایک ایسا نمونہ چھوڑا، جس کی توسیع سے اردو کی نعتیہ شاعری مضامینِ تازہ اور حسن بیان سے مالا مال ہو کر عروج تک پہنچی اور نعت گوئی کا وہ دور شروع ہوا جسے امیرؔ و محسنؔ کا دور کہا جا سکتا ہے جس میں یہ صنف اعلیٰ معیار سے ہم کنار ہوئی۔

محسنؔ کاکوروی کی نعت سے وابستگی ان کے عشق رسولؐ کا زبردست اظہار ہے۔کلیاتِ محسنؔ میں پانچ قصائد چودہ مثنویاں، ایک مسدس، اٹھائیس رباعیات اور غزلیں، نظمیں بطور مناجات شامل ہیں۔ان کی تمام تر شاعری مدحِ نبیؐ کے لیے مخصوص ہے۔مگر سب سے زیادہ شہرت ان کے قصیدۂ لامیہ کو حاصل ہوئی۔جس کا عنوان ''مدح خیر المرسلین'' ہے۔چند اشعار ملاحظہ ہوں:ـــ

سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لائی ہے صبا گنگا جل
گل خوش رنگ، رسول مدنی العربی
زیب دامانِ ابد ،طرۂ ودستار ازل
نہ کوئی اس کے مشابہ ہے، نہ ہمسر، نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل، نہ مقابل، نہ بدل[۱]

نعت گوئی کے دورِ جدید کی داغ بیل ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پڑی۔ملتِ اسلامیہ میں فکری انقلاب تیز تر ہو گیا۔نعت میں نیا طرز احساس، اجتماعی شعور اور تازہ لے پیدا کرنے والوں میں حالؔی ،ظفر علی خان اور اقبالؔ کے نام سرفہرست ہیں۔جنگ آزادی اور تحریکِ خلافت دونوں نعت میں استغاثہ کے محرک ہیں اور اردو نعت میں استغاثہ کا ایک کثیر سرمایہ اس دور میں نظر آتا ہے۔مولانا ظفر علی خان کا استغاثہ دیکھیے:ـــ

جاگ اے یثرب کے میٹھی نیند کے ماتے کہ آج
لٹ رہا ہے آنکھوں آنکھوں میں تری امت کا راج
سر چھپانے کو ٹھکانہ بھی انہیں ملتا نہیں
لے چکی ہے جن کی ہیبت ایک عالم سے خراج[۲]

حالؔی کی وہ معروف مناجات جس نے اردو نعت میں قومی وملی مسائل کے ذکر کو رواج دیا اس شعر سے شروع ہوتی ہے:ـــ

۱۔ محسن کاکوروی: کلیات محسن (لکھنو، یوسفی پریس س۔ن) ص ۱۷۵

۲۔ ظفر علی خان: بہارستان (لاہور، مکتبہ کارواں، س۔ن) ص ۳۹

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پر دیس میں وہ آج غریب الغربا ہے[۱]

اقبالؔ نے براہِ راست نعت گوئی کے بجائے مختلف نظموں میں آنحضرتؐ کی مدح، ان کی سیرت و پیغام اور عشق رسولؐ کے بارے میں نعتیہ اشعار کہے۔ سنائی کے مزار پر کہے گئے اشعار، ''ذوق وشوق''، ''بلالؓ''، ''حضور رسالت مآبؐ میں''، ''شفاخانہ حجاز''، ''صدیقؓ''، ''روحِ محمدؐ سے'' ایسی نظمیں ہیں، جن میں اقبال کی نعت گوئی کے عمدہ نمونے ملتے ہیں:۔

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یسیں، وہی طٰہٰ[۲]

اقبال وظفر علی خان کے بعد سے اب تک اردو نعت کا سفر شعرا کے جذبۂ عشق اور جذب وشوق کی حامل نعتیہ شاعری کے ساتھ جاری وساری ہے۔ اردو شاعری کی اصنافِ شعر کے تجزیہ سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اگرچہ اردو شاعری کی قریباً ہر صنف میں ہمیں منظوم خراج تحسین کی جھلکیاں نظر آتی ہیں تاہم باقاعدہ طور پر شعرا کو منظوم خراجِ تحسین کی روایت ہمیں بیسویں صدی کے آغاز میں پنپتی دکھائی دیتی ہے اور بالخصوص عہدِ سرسید میں حالیؔ وشبلیؔ کے یہاں ہم اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس عہد کے دیگر شعری مجموعوں میں بھی جستہ جستہ منظوم خراجِ تحسین کے نمونے ملتے ہیں۔ مگر یہ جان کر خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں اقبال ہی بالخصوص ایسا شاعر دکھائی دیتا ہے جس نے سب سے زیادہ شخصیات کو خراجِ تحسین پیش کیا اور خوش قسمتی سے اقبال ہی اردو شاعری کی تاریخ میں وہ واحد ہستی ہے جسے سب سے زیادہ منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

۱۔ الطاف حسین حالی: مسدس مدوجزر اسلام (لاہور۔ تاج اینڈ کمپنی۔ س۔ن) ص ۱۲۵

۲۔ علامہ اقبال: کلیات اقبال (اردو) ص ۳۱۷

فصلِ سوّم:

اقبال اور منظوم خراجِ عقیدت کی روایت

اب ہم اقبال جیسی نابغہ روزگار ہستی کی طرف توجہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں جو آفاقی مقام حاصل ہوا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اقبال کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں بہت سے عناصر کارفرما رہے ہیں۔اقبال نے مشرق ومغرب کے علوم وفلاسفہ سے استفادہ کیا،انھوں نے ہر حکمت کو اپنا گمشدہ مال تصور کرتے ہوئے حاصل کرنے کی کوشش کی اورانھوں نے ہر چشمے سے اپنا دل ودماغ سیراب کیا۔اگر ہم اقبال کی نظم ونثر کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو ہمیں یہ جان کر حیرت انگیز خوشی ہوتی ہے کہ اقبال نے جن جن شعرا،فلاسفہ، سیاست دان ،حکما اور مشاہیر سے متاثر ہوئے یا ان کے خیالات سے استفادہ کیا،تقریباً سبھی کو اقبال نے سراہا اور شعر کی زبان میں خراجِ عقیدت پیش کیا۔اقبال کے کلام اردو اور فارسی میں ایسی شخصیات کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔یہاں ہم ان شخصیات میں سے صرف ان معروف شعرا کا ذکر کریں گے جن سے اقبال بہت متاثر ہوئے۔ان میں اقبال کے پیش رو شعرا کے ساتھ ساتھ اقبال کے ہم عصر شاعر بھی شامل تھے۔طاہر تونسوی اپنی مرتب کردہ کتاب ''اقبال اور مشاہیر'' کے دیباچے میں یوں رقم طراز ہیں:

''اقبال کی عظمت ہے کہ انھوں نے ان مشاہیر کا نہ صرف احترام کیا بلکہ ان سے جہاں جہاں اکتساب کیا،اس کا برملا اظہار کیا۔حالانکہ اقبال کو جو مرتبہ ان کی زندگی میں مل گیا تھا ان میں سے بہت سے مشاہیر کو ان کے مرنے کے بعد بھی نہیں ملا۔مگر صرف یہی بات ان کے کریڈٹ میں جاتی ہے کہ اقبال ان سے کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے اور اقبال کے ساتھ ان کا ذکر بھی ناگزیز ہوگیا۔'' [1]

اقبال نے جن شعرا پر باقاعدہ نظمیں کہیں،ان میں سرفہرست ''مرزا غالب'' ہے۔غالبؔ ان چند شخصیات میں سے ہیں جنھیں علامہ نے اپنی زندگی کے ہر دور میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔اقبالؔ نے غالب کو سب سے پہلے خراجِ تحسین ۱۹۰۱ء میں ایک اردو نظم کی صورت میں ادا کیا۔یہ نظم ''مرزا غالب'' کے عنوان سے رسالہ مخزن کے شمارہ ستمبر ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی تھی۔محققین وناقدینِ اقبال نے اس نظم کو بہت سراہا ہے۔غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''یہ نظم اس (غالب) کی بارگاہ میں ایک ایسا گراں بہا خراج ہے جو کوئی دوسرا شاعر پیش نہیں کر سکا۔'' [2]

---

[1] طاہر تونسوی: اقبال اور مشاہیر (دہلی،اعتقاد پبلشنگ ہاؤس،۱۹۸۱ء) ص ۱۴

[2] غلام رسول مہر: مطالب بانگ درا (لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز،اشاعت پنجم،۱۹۷۶ء) ص ۸

پروفیسر صدیق جاوید کہتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کی اس نظم سے بہتر کوئی اور منظوم خراج غالبؔ کی نذر نہیں ہوا۔''[۱]

اقبال کی نظم ''مرزا غالبؔ'' اقبال کی غالبؔ سے عقیدت ہی کی مظہر نہیں ہے بلکہ اقبال کے تنقیدی شعور کی آئینہ دار بھی ہے:

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا | ہے پر مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا | زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

دید تیری آنکھ کو اس حسن کو منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر | محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر | خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرا میدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے[۲]

اس نظم کے علاوہ بھی اقبال نے اپنے نظم ونثر و مکاتیب میں جا بجا غالبؔ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ یومِ غالب کے سلسلے میں خواجہ حسن نظامیؔ کے نام اپنے مکتوب میں غالب کو فارسی میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مئے این ساقیان لالہ رو ذوقے نمی بخشد
زفیضِ حضرتِ غالب ہمان پیمانہ باز آور[۳]

مرزا غالبؔ کے علاوہ بھی اقبال نے ہندوستان کے شعرا میں سے مولانا حالیؔ و شبلیؔ کو بھی منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اقبال حالیؔ کی مسدس ''مدوجزر اسلام'' کے بہت مداح تھے۔ انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں مولانا حالی سے اقبال کو شرفِ نیازمندی بھی حاصل ہوا۔ بانگ دار میں شامل نظم ''شبلیؔ و حالیؔ''، اقبالؔ کی حالیؔ و شبلیؔ سے بے پناہ عقیدت کی آئینہ دار ہے۔ حالیؔ کی صد سالہ برسی پر اقبال نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا:

طوافِ مرقدِ حالیؔ سزد اربابِ معنی را
نوائے او بجا نہا افگند شورے کہ می دانم

---

[۱] صدیق جاوید: مضمون تنقید غالب میں اقبال کا حصہ (مشمولہ اقبال ریویو، لاہور، جنوری ۱۹۸۴ء) ص ۲۲۹

[۲] کلیات اقبال اردو ص ۵۶

[۳] رفیع الدین ہاشمی (مرتب): خطوطِ اقبال (لاہور مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۶ء) ص ۱۲۰

بیا تافقر و شاہی درحضور او بہم سازم
توبہ خاکش گہر افشاں ومن برگِ گل افشانم[۱]

مرزا داغ، جن کا شاگرد کہلانے پر اقبال کو ہمیشہ فخر رہا ان کے بارے میں لکھتے ہیں: ۔

جنابِ داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
ترے جیسے کو کرڈالا سخنداں بھی، سخنور بھی[۲]

''داغ'' کے عنوان سے اقبال نے جو مرثیہ لکھا اس بات کی دلیل ہے کہ اقبال کی ناقدانہ صلاحیتوں نے اپنے استاد کو کتنا منفرد اور بے مثال سمجھا۔ جس کی موت محض ایک شخص کی موت نہ تھی بلکہ ایک مکمل تہذیب اور بھرپور لسانی شعور کی موت تھی: ۔

چل بسا داغ، آہ میت اس کی زیبِ دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے[۳]

اقبال تاسف سے کہتے ہیں کہ اس دنیا میں بے شک ایسے سیکڑوں شاعر آئیں گے جو فن کی باریکیوں اور فکر کی نکتہ آفرینیوں کے جوہر دکھائیں گے لیکن ساتھ ہی ساتھ اقبال اس بات کے لیے بھی فکرمند ہیں کہ: ۔

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون[۴]

اور پھر خاک دِلی کو مخاطب کرتے ہوئے داغ کے فراق میں اقبال کے یہ گلوگیر اور رقت انگیز اشعار دیکھیے: ۔

اشک کے دانے زمینِ شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی رو اے خاک دِلی داغ کو روتا ہوں میں[۵]

داغ کے اسی مرثیہ میں اقبال امیر مینائی کو بھی خراج عقیدت پیش کرتے ہیں: ۔

توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر
چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر[۶]

اکبر الہ آبادی کے ظریفانہ اور اصلاح پر مشتمل رنگ سے بھی اقبال متاثر تھے اور نظم ونثر میں جب بھی موقع ملا انھوں نے اکبر کی فوقیت کا اعتراف کیا۔ اس اعتراف کی نمایاں مثالیں بانگ درا کے آخر میں اکبری رنگ کے چند ظریفانہ قطعات سے مل جاتی ہیں۔

۱۔ شیخ عطاءاللہ (مرتب): اقبال نامہ (حصہ اول) (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء) ص ۲۶۹

۲۔ عبدالواحد معینی، سید (مرتب): باقیات اقبال (لاہور آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء) ص ۳۹۵

۳، ۴، ۵، ۶۔ کلیاتِ اقبال (اردو) ص ۱۱۷۔۱۱۵

اقبال برملا اعتراف کرتے ہیں: ؎

ختم تھا مرحوم اکبر پر ہی یہ رنگ سخن
ہر سخنور کی یہاں طبعِ رواں جاتی ہے رک[۱]

اکبر کی وفات پر اقبال نے جو مرثیہ لکھا وہ "پیام مشرق" کے پہلے ایڈیشن میں شائع ہوا تھا۔ اقبال کہتے ہیں: ؎

دریغا کہ رخت از جہان بست اکبر
حیاتش بحق بود روشن دلیلے
دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی
دلش پرورش دادۂ جبرئیلے[۲]

اقبال نے صرف برصغیر پاک و ہند کے قدیم و ہم عصر شعرا ہی کو نہیں سراہا بلکہ یورپی اور فارسی اور عربی کے شعرا کی بھی تحسین کی ہے۔ مثال کے طور پر مولانا رومؔ، جن کی مثنوی معنوی جو پہلوی زبان کا قرآن کہی جاتی ہے، سے اقبال بہت متاثر تھے اور اپنی شاعری میں جابجا انھیں پیر و پیشوا گردانتے ہیں، کہتے ہیں: ؎

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز[۳]

ایک اور مقام پر اپنی اور رومیؔ کی مماثلتیں اس طرح بیان کرتے ہیں: ؎

چو رومی در حرم دادم اذان من
ازو آموختم اسرار جان من
بہ دور فتنۂ عصر کہن او
بہ دور فتنۂ عصر روان من[۴]

فارسی شعرا میں سے اقبال، رومیؔ کے بعد سب سے زیادہ بیدلؔ سے متاثر ہیں اور اپنے کلام میں بیدلؔ کے خیالاتِ عالیہ سے استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بانگِ درا کے حصہ سوم میں اقبال بیدلؔ کے ایک شعر پر تضمین کرتے ہیں اور انھیں مرشدِ کامل قرار دیتے ہیں۔

۱۔ محمد عبداللہ قریشی: معاصرین اقبال کی نظر میں (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷) ص ۱۵۷

۲۔ علامہ اقبال: پیامِ مشرق (لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۲۳ء، طبع اوّل) ص ۱۱۹

۳۔ علامہ اقبال: کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۷۹۶

۴۔ ایضاً ص ۹۳۸

اسی طرح جرمنی کے مایہ ناز شاعر گوئٹے اور اس کی تصنیف ''فـــاوســـٹ'' سے اقبال بہت متاثر ہیں اور اپنی شاعری اور نثر میں بھی گوئٹے کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اسے نکتہ دانِ المنی قرار دیتے ہیں۔

''پیـــامِ مشرق '' کے دیباچے میں اقبال نے جرمن ادب کی مشرقیت کا مجملاً تذکرہ کیا ہے اور اس تحریک پر گوئٹے نے جو اثر ڈالا ہے اس کی طرف بھی مختصر اشارے کئے ہیں۔ پیام مشرق کی پہلی نظم میں انھوں نے گوئٹے کا ذکر جس جذباتی خلوص اور انتہائی عقیدت مندی سے کیا ہے وہ دنیا کے ادب میں اپنی نظیر آپ ہے:ـ

پیر مغرب شاعر المانوی

آن قتیل شیوہ ہای پہلوی

بست نقش شاہد ان شوخ و شنگ

داد مشرق راسلامی از فرنگ

در جو ابش گفتہ ام پیغام شرق

ماہتابی ریختم برشامِ شرق[1]

مذکورہ بالا مثالیں نمونہ ''مشتے از خروارے'' قرار دی جاسکتی ہیں۔ اس لیے کہ اقبال نے ان شعرا کے علاوہ بھی بہت سے شاعروں کو اپنے کلام میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

---

[1] کلیاتِ اقبال (فارسی) ص۱۸۶

باب دوّم:

منظوم خراجِ عقیدت: حیات اقبال میں

فصل اوّل: منظوم خراجِ عقیدت کے ابتدائی آثار اور پہلی با قاعدہ نظم ۱۹۰۴ء

فصل دوّم: یورپ سے واپسی (۱۹۰۸ء) پر خیر مقدمی نظمیں

فصل سوّم: ۱۹۳۱ء میں دنیائے عرب کا دورہ اور عرب شعرا کا منظوم خراجِ عقیدت

فصل چہارم: پہلا اقبال نمبر ۱۹۳۲ء اور شعرائے ہند

فصل پنجم: اردو کے شعرا کی تحسینی منظومات۔ مختصر جائزہ

فصل ششم: یوم اقبال کی منظومات

فصل اوّل:

منظوم خراجِ عقیدت کے ابتدائی آثار

اقبال زمانۂ طالب علمی ہی میں لاہور کے بازارِ حکیماں کے مشاعروں میں شریک ہونے لگے تھے۔ ان مشاعروں میں شریک ہونے والے سخن فہم حضرات اقبال کا ابتدائی کلام سن کر بھانپ گئے کہ اردو شاعری کے افق پر ایک نیا ستارہ نمودار ہوا ہے۔ اقبال ان مجالس میں عموماً اپنا کلام تحت اللفظ سے سناتے تھے مگر ان کی آواز نہایت دل گداز تھی اس لیے اسی زمانے میں بعض بے تکلف دوستوں کے اصرار پر انھوں نے کبھی کبھار اپنا کلام ترنم سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سر عبدالقادر اپنے مضمون ''کیفِ غم'' میں تحریر کرتے ہیں:

> ''میرزا صاحب (میرزا ارشد گورگانی) ہمیشہ تحت اللفظ سے پڑھتے تھے انھوں نے اقبال کی روز افزوں قبولیت کو دیکھ کر محسوس کیا کہ اقبال کی خوش آہنگی اس کی نظم کو پر لگا رہی ہے اور اپنی نظم میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ مصرع لکھا:
>
> ''نظمِ اقبالی نے ہر اک گویا کر دیا''[۱]

مذکورہ بالا مصرعے کو گویا اقبال کی شان میں منظوم خراجِ عقیدت کا آغاز کہا جا سکتا ہے مگر صحیح معنوں میں اقبال کی شہرت کا آغاز انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں ان کی شرکت سے ہوا۔ اور ان مشاعروں میں اقبال کا منفرد انداز سخن دیکھ کر ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلیؔ، مولانا حالیؔ، سر محمد شفیع، سر عبدالقادر اور خواجہ حسن نظامیؔ جیسے اکابر ادب اور نامور شخصیات بھی بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو گئیں۔

اقبال اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں لاہور کے قابل نوجوانوں کے دائرے کا مرکز بن گئے تھے۔ اس دائرے میں اس دور کے ذہین شاعر اور نوجوان فلسفیوں کے علاوہ انگریزی اور غیر ملکی تعلیم کے حامل افراد بھی شامل تھے۔ انھی نوجوانوں میں شاہ دین ہمایوںؔ بھی تھے جو ۱۸۹۰ء میں ولایت سے بیرسٹر بن کر آئے۔ وہ اپنی پہلی نظم ''چمن کی سیر'' اکتوبر ۱۹۰۱ء میں اپنے دوستوں کا ذکر یوں کرتے ہیں:

---

[۱] محمد حنیف شاہد (مرتب): نذرِ اقبال (لاہور، بزمِ اقبال، اشاعت دوم، ۲۰۰۰ء) ص ۸۴

اعجازؔ دیکھ تو سہی یاں کیا سماں ہے آج
نیرنگؔ آسمان و زمیں کا نیا ہے رنگ
اقبالؔ تیری سحربیانی کہاں ہے آج
ناظرؔ کمان فکر سے مار ایک دوخدنگ
ازنغمہ ہائے دلکش این چار یار را
پنجاب خوش نواست ہمایوںؔ دیار ما[۱]

اس شعری اقتباس میں ہمایوںؔ نے اپنے محبان ورفقیان میں اقبال کے علاوہ اعجاز حسین اعجازؔ، میر غلام بھیک نیرنگؔ اور چودھری خوشی محمد ناظرؔ کا بھی ذکر کیا ہے۔ ہمایوںؔ، اپنی ایک اور نظم شالامار باغ کشمیر (مخزن ۱۹۰۳ء) میں اقبال کو اس طرح یاد کرتے ہیں:ے

ناظرؔ بڑا مزا ہو جو اقبالؔ ساتھ دے
ہر سال ہم ہوں شیخ ہو اور شالامار ہو[۲]

مذکورہ بالا شعر میں شیخ سے مراد، شیخ عبدالقادر مدیر ''مخزن'' ہیں۔ ہمایوں کے ان اشعار سے پتا چلتا ہے کہ اقبال نہ صرف اکابرین بلکہ اپنے ہم عصر شاعروں اور دوستوں میں بھی ہر دل عزیز تھے اور ان کے دوست اور محبان ورفیقان ان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔

شاہ دین ہمایوں کے مذکورہ بالا اشعار کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے۔ کہ ان میں بڑے محبت آمیز انداز میں اقبال کا ذکر ہے تاہم پہلی باقاعدہ نظم جس کا موضوع اقبال کی شخصیت وشاعری اور تحسین وتعریف ہو، مئی ۱۹۰۴ء کے مخزن میں شائع ہوئی ہے۔ شاعر بدالدین قیصرؔی ہیں۔ نظم کی ابتدا میں قیصرؔی صاحب رقم طراز ہیں:ے

''یہ نظم میں نے اپنے ارادے سے نہیں لکھی بلکہ اقبال کی زبردست سخن وری نے جبراً مجھ سے لکھوائی ہے۔ گویا یہ خراج ہے جوان کی شاعری نے میری شاعری سے لیا ہے۔ ہر چند اقبال سلمہ اللہ تعالٰی بطور شاعر کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں مگر میرے خیال میں ان کی شاعری کا پایہ ان کی شہرت سے بلند تر ہے''۔[۳]

اس نظم کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر اسے یہاں درج کیا جاتا ہے:ے

۱۔ میاں محمد شاہ دین ہمایوں: جذبات ہمایوں (لاہور، مرکنٹایل پریس، س۔ن) ص۸۱

۲۔ جذبات ہمایوں، ص۸۶

۳۔ احسان الٰہی اسالک (مرتب): حضور شاعرِ مشرق (لاہور، عزیز پبلیشرز، ۱۹۷۷ء) ص۲۱

اقبال

مرحبا اقبال اس جادوبیانی پر تری
حبّذا طرز جدید شعر خوانی پر تری
واہ واہ ایسی طبیعت کی روانی پر تری
آفرین اس نکتہ دانی نکتہ رانی پر تری
شمع ہے تو شاعری کی انجمن کے واسطے
فکر تیرا دام ہے مرغِ سخن کے واسطے

بلبل پنجاب تو پنجاب ہے گلشن ترا
پُر ہے نوگلہائے مضموں سے سدا دامن ترا
جن کا دانہ دانہ خرمن ہو وہ ہے خرمن ترا
دوسروں کے سو تصنع ایک سادہ پن ترا
نقش تصویرِ مضامیں کے لیے مانی ہے تو
خطۂ ہندوستاں میں غالبِ ثانی ہے تو

ہیں نئے مضموں ترے باغِ سخن کے باغباں
چست تیری بندشیں سب سے جدا طرز بیاں
چشمۂ کوثر میں ہے دھوئی ہوئی تیری زباں
جو ادا تجھ میں نکلتی ہے وہ اوروں میں کہاں
از ہماں خوباں برعنای یگانہ بودۂ
وزجمالِ خویش در عالم فسانہ بودۂ

صرف فکر شعر جب تیری طبیعت ہو گئی
درد قرباں ہو گیا، صدقے فصاحت ہو گئی
تیرے طوفان مضامیں سے یہ حالت ہو گئی
سطر مسطر موجۂ بحرِ بلاغت ہو گئی
یہ کہیں روح القدس کی کار فرمائی نہ ہو
شعر کے پردے میں اعجازِ مسیحائی نہ ہو

کی ہے خالق نے عطا چشم تماشا جو تجھے
ہو دلِ پر درد جس میں وہ دیا پہلو تجھے
ہے الف اللہ کا سروکنارِ جو تجھے
نغمۂ قمری صدائے نعرۂ یا ہو تجھے
تو پسندِ خاطرِ خورد و کلاں ہونے کو ہے
یعنی اے یوسف عزیزِ کارواں ہونے کو ہے

اے شہہ ملک سخن روح و روانِ قیصری
اے کہ موزوں ہے ترے سر پر کلاہِ برتری
اے کہ تیری نظم ہے نورِ خدِ جاں پروری
اے کہ تیرا شعر ہے خالِ لبِ افسوں گری
طبع تیری غیرت صد ابرنیسانی رہے
ذات تیری مظہرِ الطافِ یزدانی رہے[۱]

۱؎ حضور شاعرِ مشرق ص۲۲،۲۱

فصل دوم:

یورپ سے واپسی (۱۹۰۸ء) پر خیر مقدمی نظمیں

علامہ اقبال ستمبر ۱۹۰۵ء میں مزید تحصیلِ علم کے لیے یورپ روانہ ہوئے اور جولائی ۱۹۰۸ء میں وطن لوٹے۔ اقبال کے واپس آنے کی خوشی میں اور ان کے استقبال کے لیے اقبال کے بہت اچھے دوست اور شاعر میرزا غلام بھیک نیرنگ نے ''ترانۂ مسرت'' کے عنوان سے نظم کہی۔ یہ نظم انھوں نے دہلی میں درگاہ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء میں احباب کی ایسی مجلس میں پڑھ کر سنائی جس میں خواجہ حسن نظامی، شیخ عبدالقادر، شیخ محمد اکرام، مولانا راشد الخیری اور سید جالب دہلوی موجود تھے۔ نیرنگ بڑے دل کش انداز میں اقبال کو خوش آمدید کہتے ہیں:؎

یورپ کی سیر کر کے اقبال واپس آئے
خوشیاں منائیں مل کر اہلِ وطن وطن میں
ہے آمدِ مسرت اقبال تیری آمد
خوشیاں ہیں اہل دل میں عیدیں ہیں اہل فن میں
سر آنکھوں پر بٹھایا یورپ میں تجھ کو سب نے
غربت میں بھی رہا تو گویا سدا وطن میں
پھر تیرے دم سے ہوں گے تازہ سخن کے چرچے
پھر رونقیں رہیں گی یاروں کی انجمن میں [۱]

علامہ اقبال کے سفر ولایت سے واپسی پر یہ نوٹ اقبال کے دوست محمد دین فوق نے اپنے رسالہ ''کشمیری میگزین'' لاہور ماہ اگست ۱۹۰۸ء میں شائع کیا تھا۔ اور دو استقبالیہ نظمیں بھی شائع کیں جو اقبال کی لاہور آمد پر ۲۸ جولائی ۱۹۰۸ کو بمقام بھاٹی دروازہ لاہور سنائی گئیں۔ ذیل میں ان دو نظموں کے اقتباسات درج کیے جاتے ہیں۔

---

[۱] نیرنگ خیال: اقبال نمبر (لاہور، ادارہ فروغِ اردو ۱۹۳۲ء) ص ۲۷۳

منشی اللہ یار جوگی (۱۸۸۷ء۔۱۹۴۰ء): کی یہ نظم اقبال سے ان کی بے پایاں محبت کی شاہد ہے فرماتے ہیں:۔

کدھر ہے کیفِ مسرت مجھے سنبھال سنبھال
کہ ہو کے آئے ولایت سے ڈاکٹر اقبال
خدا کے فضل سے وہ کی ہیں ڈگریاں حاصل
کہ اس زمین میں جن کا ہے اندراج محال
ترس ترس کے یہ موقع خوشی کا پایا ہے
کہ آئے خیر سے گھر پھر کے حضرت اقبال
تھی حاجت ایسے ہی لیڈر کی اہل خطہ کو
جوں خیال، جواں سال اور جواں سال[1]

منشی غلام علی خان صاحب غلامی: جو خوشنویس پیسہ اخبار، لاہور تھے۔ اقبال کی واپسی پر اہلِ لاہور کی خوشیوں کی یوں ترجمانی کرتے ہیں:۔

آمدِ اقبال سے جشن طرب گھر گھر ہوا
اوج پر آج پھر لاہور کا اختر ہوا
دوست اور احباب خرم ہیں ترے دیدار سے
جب کہ تو مثل ہلال عید جلوہ گر ہوا
ڈگریاں پا کر ولایت سے تو آیا کامیاب
فلسفہ میں خاص کر بیکن کا تو ہم سر ہوا
کیوں نہ ہو ہندوستان میں تیرا شہرہ چار سو
تیرا علم و فضل اور اخلاق جب برتر ہوا
فاضلان دہر میں پایا ہے تو نے امتیاز
کامیابی کا قلعہ ہمت سے تیری سر ہوا[2]

۱۔ رحیم بخش شاہین (مرتب): اوراق گم گشتہ (لاہور، اسلامک پبلیکشنز ۱۹۷۵ء) ص ۴۱۹۔۴۱۶

۲۔ ایضاً

فصل سوم:

۱۹۳۱ء میں دنیائے عرب کا دورہ اور عرب شعرا کا منظوم خراجِ عقیدت

شاہ دین ہمایوںؔ اور بدرالدین قیصریؔ کی طرف سے جاری ہونے والا منظوم خراجِ عقیدت کا یہ سلسلہ ہمیں اقبال کی ساری زندگی میں جاری وساری نظر آتا ہے۔کبھی یہ سلسلہ دوست شاعر حضرات کی طرف سے تحسین کی صورت میں اور کبھی ''شکوہ'' و''جواب شکوہ'' اور''اسرارِخودی'' پر منظوم اعتراضات کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔کبھی اقبال کے نام مکاتیب میں دوست خوش ہوکر قطعات کی شکل میں داد دیتے ہیں ہی نے نہیں بلکہ کبھی اقبال کی کسی نظم کی تعریف میں اخبار اور رسائل منظوم داد پیش کرتے ہیں۔ایک اور خوش آئند بات یہ ہے کہ اقبال کو نہ صرف ہندوستان کے عوام (مسلمان و ہندو دونوں) اور جہاں جہاں اقبال کی بانگ درا سنائی دی، اہلِ درد علماء اور شعرا نے اس کا خیر مقدم کیا۔یہی صورت ہمیں دنیائے عرب کے ہاں بالخصوص مصر میں دکھائی دیتی ہے۔اقبال نے ۱۹۳۱ء میں مصر اور فلسطین کا سفر کیا۔سرزمین حجاز سے یوں بھی اقبال کو بے پناہ عقیدت تھی۔اور ہندوستان کے علاوہ اسی زمین کے شعرا نے بڑھ کر اقبال کو سب سے پہلے خوش آمدید بھی کہا۔ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''عربوں سے علامہ اقبال کا اولین رابطہ ۱۹۳۱ء میں ہوا۔مصر میں پانچ روزہ قیام کے دوران میں انھوں نے بعض تاریخی مقامات دیکھے۔عرب اہلِ علم، صحافی، دانشور اور سیاست دان پہلی بار براہ راست شاعرِ مشرق کے خیالات سے متعارف ہوئے''۔[۱]

اہلِ عرب نے بہت جوش وخروش سے اقبال کا استقبال کیا اور جہاں اقبال کے بارے میں مضامین پڑھے گئے وہیں عرب شعرا نے انھیں منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا اس ضمن میں ہمارے سامنے قاہرہ کے دو عرب شعرا کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ان میں پہلا نام عبدالرحمٰن بزمی کا ہے جو جمعیۃ الشبان المسلمین کے سرگرم رکن تھے۔اس نظم کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ یہ حضرت علامہ کے سفر قاہرہ کے موقع پر کہی گئی۔عبدالرحمٰن بزمی کہتے ہیں:

اھلا فقد برکت للشرق آمال
و مرحبا زارنا مولای اقبال
یتلوہ شوکت مولانا و رفقتہٗ
کالصبح ضاء فضائت معہ آصال

---

[۱] رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر : اقبالیاتی جائزے (لاہور، گلوب پبلیشرز، ۱۹۹۰ء) ص ۱۳۳

يـــا شـــاعـــر الهـنـد و الاسلام فـقـد ظـفـر لـكَ
إســلام مـــنـک بـــآ يــــات لهـــا بـــالُ
انـــت الـــذى ضـــربـــت فـــى فـضـلِ مـقـولـــهُ
وبيـــض أ فـــعـــالـــه لـــلـــنـــاس أمثـــالُ ۔[۱]

ترجمہ:-

۱۔ خوش آمدید کہ اہلِ مشرق کی آرزوئیں مجتمع ہوگئی ہیں۔مرحبا کہ مولانا اقبال نے ہمیں زیارت کا شرف بخشا ہے۔

۲۔ ان کے پیچھے مولانا شوکت اوران کے ہمراہی بھی آئے ہیں۔ایک صبح روشن ایسا سامان ہے جس سے ہماری شامیں بھی روشن ہوگئی ہیں۔

۳۔ اے ہندوستان اوراسلام کے شاعر! تیرے سبب اسلام کواہم اورمعجزانہ کامیابی حاصل ہوئی۔

۴۔ آپ ہی تو وہ شاعر ہیں جس کے ارشادات ضرب المثل بن گئے ہیں اورآپ کے روشن کارنامے دنیا والوں کے لیے مثال ہیں۔

دوسری نظم محمد عبدالغنی حسن کی ہے جودارالعلوم قاہرہ میں استاد تھےاورروزنامہ الاھرام میں لکھتے رہے تھے۔یہ اشعار بھی حضرت علامہ کے سفرِ قاہرہ کے موقع پر کہے گئےاور الاھـــــرام کی زینت ہیں جس میں ان کے معائنہ جامعہ ازھر کی خبریں بھی موجود ہیں عبدالغنی حسن کہتے ہیں۔

إلـــى الـــدكتـــور إقبـــال
تـــحيـــاتـــى و إجـــلالـــى
إلـــى مـــن يـــات فـــى فـكـرى
إلـــى مـــن صـــار فـــى بـــالـــى
إلـــى مـــن اشـعــل الـجـذو ـة
مـــنـــى أى إشـــعـــال
يـــحيّـــى شـــاعـــر الأهـــرام
فيک الشـــاعـــر الـعـــالـــى
فـــعـــش لـلـهـنـد تـلـهـمـهـا
ودُم لـــلـــوطـــن الـغـــالـــى ۔[۲]

۱۔ ظہوراحمد اظہر ،ڈاکٹر: اقبال عرب شعرا کی نظر میں (لاہور،مکتبہ العلمیہ ،۱۹۷۷ء) ص ۹۶

۲۔ اقبال عرب شعرا کی نظر میں: ص ۹۸

ترجمہ:-

۱۔ میں ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں ہدیۂ سلام واحترام پیش کرتا ہوں۔

۲۔ اس ہستی کی خدمت میں جو میرے فکر میں جاگزیں ہے اور اب میرے ذہن میں جلوہ گر ہے۔

۳۔ اس شاعر کی خدمت میں جس نے میری چنگاری کو شعلہ بنا دیا ہے۔

۴۔ اے بلند مقام شاعر! الاھرام کا شاعر تجھے سلام پیش کرتا ہے۔

۵۔ آپ سرزمین ہند کو فکر والہام مہیا کرنے کے لیے زندہ رہیے۔ قیمتی وطن کے لیے قائم ودائم رہیے۔[1]

---

[1] اقبال عرب شعراء کی نظر میں : ص۴۰،۳۹

فصل چہارم:

پہلا اقبال نمبر ۱۹۳۲ اور شعرائے ہند

اگرچہ اقبال کی زندگی میں ایسا کوئی شعری مجموعہ مرتب نہیں ہو سکا جس میں اقبال کے بارے میں کہی جانے والی سب نظمیں مجتمع ہوں، تاہم منظوم خراجِ تحسین کا یہ سلسلہ اقبال کی زندگی میں پورے جوش وخروش سے جاری رہا۔ اور جب ہم ایسا کوئی مجموعۂ نظم ونثر ڈھونڈتے ہیں جس میں اقبال کو بحیثیت شاعر و سیاستدان، حکیم و فلسفی اور دانائے راز کے طور پر ان کی زندگی میں تسلیم کیا گیا ہو تو ہمارے سامنے سب سے پہلے ''نیرنگِ خیال '' آتا ہے۔ یہ نمبر حکیم یوسف حسن خان کی زیرِ ادارت ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۲ء کے مشترکہ نمبر کی صورت میں نکالا گیا۔ اس نمبر میں ہمیں اقبال کے فکر و فن پر اہلِ علم وفن کے ستائیس مضامین اور اٹھارہ شعرا کی نظمیں ملتی ہیں، جو اقبال کی شان میں بجا طور پر نیرنگِ خیال کا بہت بڑا اخراجِ تحسین ہے۔ ان شعرائے کمال میں ہمیں غلام بھیک نیرنگ، محمد دین تاثیر، حامد علی خان، احسان بن دانش، مجید ملک، جلال الدین اکبر، ابوالعلا عطا چشتی، محمد کبیر خان رسا، غلام قادر اثر، مجازی لکھنوی، کاشی پریاگی، دلبر حسن مسحور، این ایچ ہاشمی، مظہر انصاری بی۔ اے، محمد اشرف الدین یکتا، عبدالرشید ملک، عبدالحمید حمد اور عبدالحمید شوق کے نامِ نامی دکھائی دیتے ہیں۔

غلام بھیک نیرنگ کی وہ تاریخی نظم جو انھوں نے اقبال کی یورپ سے واپسی پر کہی تھی نہ صرف اس شمارے کی زینت ہے بلکہ حکیم صاحب نے اسے بطور تبرک اولیت کا درجہ دیتے ہوئے شعرائے کمال کی نظموں میں بھی اول نمبر کی جگہ دی ہے۔ پروفیسر محمد دین تاثیر کی نظم ''عالمگیر'' دراصل اقبال کی فارسی نظم کا اردو ترجمہ ہے۔ مولانا حامد علی خان کی نظم اقبال کی مشہور نظم خطاب بہ جوانانِ اسلام کی بحر وقافیے میں لکھی گئی ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

ریاضِ ہند کو تو نے لہو رو رو کے سینچا ہے
ادا تو نے کیا ملت کی تقصیروں کا کفارا
ترے سوزِ محبت کی فسوں کاری نے پگھلائے
وہ بے حس دل کہ تھے صدیوں سے ننگِ سینۂ خارا[۱]

احسان بن دانش مصنف ''حدیث ادب '' نے اپنی نظم ''تصویرِ خیالی'' میں اقبال کی تخلیق کی خیالی تصویر کھینچی ہے جس میں انھوں نے ازحکمِ خدا فرشتوں کو اقبال کے کالبد میں شبلی، گوئٹے، عمر خیام، نظیری، طوبیس وقند، میر، ٹینی سن، مومن، حالی، حافظ، غالب، سعدی، بیدل، امیر و داغ جیسے نامو شاعروں کی خوبیاں سموتے ہوئے تصور کیا اور جب

[۱] نیرنگ خیال: اقبال نمبر ۱۹۳۲، ص ۴۰۹

فرشتوں نے خدا کے حکم سے وہ پرتو بنا دیا تو:

پھر اس میں روح پھونکی باصد انداز
و دیعت کر دیا حسنِ خیالی
جسے احسان سب کہتے ہیں اقبال
یہ ہے اس کی سرشتِ بے مثالی[1]

اس شمارے کی ایک اور اہم نظم ابو العلا عطا چشتی کی ہے جو معروف مزاحیہ شاعر حاجی لق لق کے نام سے معروف ہیں۔ یہ ان دنوں بغداد میں مقیم تھے اور اپنی نظم ''آرزوئے اقبال ''میں اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال کبھی بغداد تشریف لائیں۔ وہ کہتے ہیں:

سوئے بغداد گر آئی و شرف می بخشی
تو چہ دانی چہ شود بادلِ دیوانۂ ما
بہر تسکین وقرارِ دل ناشاد آئی
ای خوشا روز کہ در بلدۂ بغداد آئی[2]

مذکورہ بالا فارسی نظم کے علاوہ ایک فارسی نظم اور رباعی جالندھر کے محمد کبیر خاںؔ اور غلام قادر آثرؔ کی بھی زینت شمارہ ہے۔ اس شمارے میں ایک ہندو شاعر کاشی پریاگی کی نظم بھی ہے جو اقبال سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے اور اپنی عقیدت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

سامری کیشوں کی نظروں میں تو جادوگر ہے تو
میں جو کہہ سکتا تو کہہ دیتا کہ پیغمبر ہے تو[3]

۱۔ نیرنگ خیال: اقبال نمبر ۱۹۳۲ء، ص ۴۰۹
۲۔ ایضاً ص ۳۹۳
۳۔ ایضاً ص ۳۹۳

فصل پنجم:

اردو کے شعرا کی تحسینی منظومات، مختصر جائزہ

یہاں ان شعرا کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جنہوں نے انفرادی طور پر اقبال کی زندگی میں ان کی شاعری و شخصیت کی منظوم تعریف و تحسین کی۔ مگر ان کے نام ''نیرنگِ خیال''، کے اقبال نمبر ۱۹۳۲ میں ہمیں نظر نہیں آتے۔ مگر یہ شعرا اس لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت کے حامل ہیں کہ ان کی اکثریت اقبال کے دوستوں، رفقا، شاگردوں، ہم عصر سیاست دانوں اور اقبال کے انتہائی قریب رہنے والے شعرا پر مشتمل ہے۔ ان شعرا میں ہمیں اکبرؔ الہٰ آبادی، مولانا ظفرؔ علی خان، حفیظؔ جالندھری، محمد حسین عرشیؔ امرتسری، حکیم طغرائیؔ، مولانا گرامیؔ، عبداللہ عمادیؔ، مولانا محمد اسماعیل مغمومؔ، آغا صادقؔ، صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ، احسنؔ مارہروی، منشی درگا سہائے سرورؔ جہاں آبادی، اسدؔ ملتانی، اسلمؔ جیراجپوری اور فیضؔ احمد فیض وغیرہ جیسے اہم نام نظر آتے ہیں۔

ذیل میں ان شعرا کی نظموں کا مختصر سا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے حروف تہجی کی ترتیب کا اہتمام کیا گیا ہے۔

۱۔ احسن مارہروی (۱۸۷۶۔۱۹۴۰ء):۔

اقبال کی طرح داغؔ کے شاگردوں میں نمایاں نام رکھتے ہیں اور اقبال سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ انھوں نے اقبال کی فرمائش پر اقبال کو داغؔ کی تصویر بھی بھیجی تھی۔ اپنی نظم ''نذرِ اقبال'' میں جو انھوں نے اقبال کی زندگی میں لکھی وہ نام بنام اقبال کی سب شعری تصانیف کی تعریف و تحسین کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

اے ادیب خوش بیاں اے شاعر شیریں زباں
تیرے سوزوساز سے معمور ہے سارا جہاں
عود ہندی بن کے پھیلی تیرے نغموں کی صدا
تو ہے شاگردِ رشید بلبلِ ہندوستاں
سامری ہے شاعری تیری کہ ہے پیغمبری
ہے طلسم معنوی میں جس کے اعجاز بیاں

زندہ بادا۔ے مصلحِ آئینِ حکمت زندہ باد
دی حیاتِ تازہ تو نے اے مسیحائے زماں
اور کیا کہیے کہ روشن تر ترا احوال ہے
تو بلند اقبال وخوش اقبال وسر اقبال ہے[۱]

۲۔ اخگر جالندھری:

اپنی نظم بعنوان ''اقبال''، میں جس کی ہیئت مسدس کی ہے، اقبال کے شعری مجموعوں کی یوں تعریف کرتے ہیں:۔

تیری ہستی کیا ہے پیغام بقا میرے لیے　　تیرے اسرار خودی ہمت فزا میرے لیے
ہیں رموز بے خودی عقدہ کشا میرے لیے　　راہبر سی بن گئی بانگ درا میرے لیے
روحِ غالبؔ، دردِ میرؔ، اقبالؔ تیرے دل میں ہے
حسن لیلائے سخن پنہاں اسی محمل میں ہے[۲]

۳۔ اسد ملتانی (۱۹۰۲ء۔۱۹۵۹ء):۔

اقبال کے ان شاگردوں میں سے ہیں جن کا اقبال سے مستفیض ہونا مسلم ہے۔ اس بارے میں پروفیسر جعفر بلوچ یوں رقم طراز ہیں:

''حضرتِ علامہ اقبال کے حلقۂ تلازمہ میں وہ غالباً واحد ایسے خوش نصیب ہیں جن کی حضرت علامہ سے فیض یابی کا دستاویزی ثبوت آج بھی موجود ہے۔ حضرت علامہ نے ان کی نظم پر اپنے ہاتھ سے اصلاح دی اور اس اصلاح یافتہ نظم کی عکسی شبیہ جو جناب اسد کے دوامِ شرف کا آئینہ ہے آج بھی ''اقبال نامہ'' میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے''۔[۳]

اسدؔ ملتانی نے اقبال کی زندگی میں منائے جانے والے اقبال ڈے میں جو ۹ جنوری ۱۹۳۸ کو دی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ کے زیر اہتمام منایا گیا، میں اقبال کی شان میں نظم پڑھی جسے حاضرین نہایت پسند فرمایا، اسلم جیراجپوری نے ''نوادرات''میں مسلم برادر ہڈ کے یوم اقبال کی تفصیلات بتاتے ہوئے لکھا ہے:

''کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں جن میں سے مولانا اسد ملتانی کی نظم جو ہمارے دہلی کے قافلے میں گئے تھے، خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے سنی گئی''۔[۴]

۱۔ ناصر زیدی (مرتب): بیاد شاعر مشرق (لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء) ص ۱۹
۲۔ نیرنگ خیال: ص ۳۵
۳۔ جعفر بلوچ (مرتب): اقبالیات اسد ملتانی (لاہور اقبال اکادمی، ۱۹۹۱ء) ص ۶
۴۔ اسلم جیراج پوری: نوادرات، ص ۲۷، ۱۲۶

اس خوبصورت نظم کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:۔

شاعروں سے ہے بہت اونچا مقام اقبال کا
کیونکہ ہم آہنگ قرآں ہے کلام اقبال کا
ذہن ہندی، علم افرنگی، نگاہِ یثربی
ہے محیط مشرق و مغرب نظام اقبال کا
اے اسدؔ محفل سہی کو تاہ دست و کم طلب
تندیٔ صہبا سے ہے گردش میں جام اقبال کا[۱]

ان کی ایک اور خوبصورت نظم بعنوان ''وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں،'' طلوع اسلام ''۱۹۳۶ء کے فروری کے شمارہ میں شائع ہوئی۔ فرماتے ہیں:۔

اٹھو مقابلہ گردش زمانہ کریں
حیات و موت کو پابستۂ قضا نہ کریں
جہاں نے اہلِ خرد کا کمال دیکھ لیا
اب اس کو واقفِ شانِ قلندرانہ کریں
اسی سے ملتِ خوابیدہ جاگ اٹھے شاید
وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں[۲]

۴۔ محمد اسلم جیراجپوری (۱۸۸۳ء۔۱۹۵۰ء):

ممتاز عالم دین تھے۔ اقبال اور محمد اسلم جیراجپوری کے تعلقات ''اسرار خودی'' کی اشاعت کے بعد ۱۹۱۵ء میں قائم ہوئے۔ مولانا نے ''اسرارِ خودی'' کی مخالفت میں لکھی گئی دو مثنویوں پر ۱۹۱۹ء میں تبصرہ لکھا تھا، جس سے اقبال بہت متاثر ہوئے۔ اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی''، ''جاوید نامہ''، اور ''پیام مشرق'' پر بھی انھوں نے سیر حاصل تبصرے کئے۔ ''جاوید نامہ'' پر اپنے مضمون میں اقبال کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:۔

ای کہ ذاتِ تست ملت را چراغ
ای کہ شعرِ تست فردوس دماغ
ای کہ درسازت نوائے زندگی
خوش سرودی نغمہ ہائے زندگی

---

[۱] اقبالیات اسد ملتانی: ص۹۹۔۹۸

[۲] ایضاً ص۱۱۰

گفتۂ تو مغز و جان شاعری
برتو می نازد جہانِ شاعری
ای کہ از آبِ حیاتی زندہ رود
برروانی ہائے تو از من درود[1]

۵۔اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی (۱۹۰۲ء۔۱۹۸۹ء):

اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی کو اقبال کے تبحر علمی اور دینی تقدس کی وجہ سے بے حد عقیدت تھی۔انھیں علامہ کی خدمت میں بارہا حاضر ہونے اور فیض اٹھانے کا موقع ملا۔اقبال کے متعلق انھوں نے زندگی میں بھی منظوم اظہار عقیدت کیا اور ان کی وفات کے بعد ان کی قریباً دس نظمیں اقبال سے متعلق ہیں۔۱۹۲۷ء میں اقبال کی یوں مدح سرائی کی نظم ''مقصود رسالت'' میں کہتے ہیں:ـ

حضرتِ اقبال آں بحرِ علوم
چشم او مستِ شراب پیر روم
دینِ فطرت را بلند آوازہ کرد
گلشن ہندوستان را تازہ کرد[2]

روزنامہ ''انقلاب'' مورخہ ۲۴ستمبر ۱۹۲۷ء میں انھوں نے ''نذر اقبال'' کے عنوان سے ایک اور فارسی نظم کہی۔کہتے ہیں:ـ

درچمن اقبال چون سازے نواخت
از غبارم یک جہانِ عشق ساخت[3]

جنوری ۱۹۲۹ء میں انھوں نے ''خطاب اقبال'' کے عنوان سے ایک اور نظم کہی جس میں وہ کہتے ہیں کہ ان (اقبال) کی فکر سے کائنات میں حشر بپا ہے،ان کی نگاہ راز حیات سے آشنا ہے۔ان کی تعریف سے حسن سفاک تر اور عشق بے باک تر ہو گیا ہے۔فرماتے ہیں:ـ

در جہاں عشق محمدؐ عام کرد
خاک بازاں را شرر آشام کرد[4]

۱۹۳۷ء میں اقبال کی شان میں ایک عاشقانہ مثنوی لکھنا شروع کی جو نامکمل رہ گئی۔اس کے شروع میں لدھیانہ کے حضرت عنایت ولی کے مزار پر حاضری کی تفصیل ہے۔اس کے بعد علامہ کا ذکر ہے۔کہتے ہیں:ـ

---

[1] محمد اسلم جیراجپوری: نوادرات،ص ۱۲۷

[2] صابر کلوروی ،پروفیسر(مرتب):اقبال کے ہم نشین (لاہور،مکتبہ خلیل،۱۹۸۵ء)ص ۴۵

[3] ایضاً ص ۴۶

[4] ایضاً ص ۴۹

سر اٹھایا سبزۂ پامال نے
تازگی بخشی ہمیں اقبال نے
پھر کیا عشق نبیؐ سے آشنا
پھر کیا زورِ علیؓ سے آشنا[1]

اپریل ۱۹۳۶ء میں اخبارات میں یہ تشویش ناک خبر شائع ہوئی کہ علامہ سر محمد اقبال علیل ہیں۔ مسلمان علامہ کی صحت کے لیے دعا کریں۔ اس موقع پر بھی اصغؔر لدھیانوی صاحب نے نظم کہی۔ جو روزنامہ زمیندار میں شائع ہوئی۔ اور اقباؔل نے اس نظم کی تحسین کی۔
اصغؔر حسین نظیر لدھیانوی کہتے ہیں۔

حضرتِ اقبال آن سالار قوم
آفتابِ مطلعِ انوار قوم
درگلوے او نواہائے خلیل
قوم از آہنگ اُو گرم رحیل[2]

کہتے ہیں کہ اقباؔل نے اہل علم کو قرآنِ حکیم کے راز بتا کر ذوقِ سلیم سے آشنا کیا۔ اور میں جو خدا کے جلوے سے نا آشنا تھا میری روح عشق کے تب وتاب سے واقف نہ تھی۔ جب اقباؔل کی آواز میرے کان میں پڑی، اس نے میرے بے جان جسم میں روح پھونک دی۔ میں نے اس سے ذکر پیغمبرؐ سنا، الفتِ حیدرؓ خریدی، میری آنکھیں صرف اس کے رخ زیبا کو دیکھنے میں محو ہیں۔ مجھے اہلِ دولت کی دنیا اور درہم ودینار سے کوئی سروکار نہیں۔ میں خاروخس میں زندگی گزار کر خوش ہوں کہ اس کے فیض فکر سے مستفیض ہوں۔ آگے چل کر کہتے ہیں:۔

اے خدا مثلِ خضر او زندہ باد
درجہان اقبال ما پائندہ باد[3]

۶۔ اکبر الہٰ آبادی (۱۸۴۶ء۔۱۹۲۱ء):

اقباؔل اور اکبؔر کا ذہنی اشتراک دونوں اکابرین کی شاعری سے بخوبی عیاں ہوتا ہے۔ اقباؔل نے اکبؔر کے رنگِ شعری کو اپنایا اور اکبؔر نے اقباؔل کی برتری اور فوقیت کا اعتراف کیا۔ اکبر الہٰ آبادی اپنی ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

---

[1] اقبال کے ہم نشین : ص۵۰۵
[2] ایضاً ص۵۱
[3] ایضاً ص۵۲

دعویٰ علم وخرد میں جوش تھا اکبر کو رات
ہو گیا ساکت مگر جب ذکرِ اقبال آ گیا[1]

۱۹۱۶ء میں اقبال نے اپنی مشہور نظم ''شمع اور شاعر'' انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی تو وہ اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے بعض اشعار زبان زدِ عام ہو گئے۔ روزنامہ زمیندار نے اپنی ۱۱اپریل ۱۹۱۶ء کی اشاعت میں اس پر تعریفی نوٹ لکھا اور اس کے چند بند شائع کیے۔ حضرت اکبر الہٰ آبادی نے یہ دیکھ کر ۱۳اپریل ۱۹۱۶ء کو مندرجہ ذیل خط مدیر ''زمیندار'' کے نام لکھا جو ۱۹اپریل ۱۹۱۶ء کے ''زمیندار'' کی زینت بنا۔ اکبر لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال کی نظم کے دو تین بند جو ''زمیندار'' میں چھپے ہیں میں نے دیکھے۔ وہ نظم اس کی مستحق ہے کہ اس کی مدح کی جائے۔ یہ رباعی پیش کرتا ہوں'':

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبعِ نور ہر حرف سے ہے تجلی حق کا ظہور
اوجِ ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور[2]

اکبر نے اقبال کی والدہ مرحومہ کا جو مرثیہ لکھا، وہ درحقیقت اقبال کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی ایک صورت ہے۔ اکبر کہتے ہیں:

حضرتِ اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں
یہ حق آگاہی، یہ خوش گوئی یہ ذوقِ معرفت
یہ طریق راستی، خودداری بے تمکنت
اس کی شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے، اہلِ دل تھے، صاحب اِسرار تھے
جلوہ گر ان میں انھیں کا ہے یہ فیضِ تربیت
ہے ثمر اس باغ کا یہ طبعِ عالی منزلت[3]

۷۔ محمد دین تاثیر (۱۹۰۲ء۔۱۹۵۰ء):

محمد دین تاثیر کا نام بھی اقبال کے دوستوں اور چاہنے والوں میں آتا ہے۔ انھوں نے ''نیرنگِ خیال'' کے اقبال نمبر میں ''اسمائے رجالِ اقبال'' کے عنوان سے ایسے لوگوں کے مختصر حالات لکھے جو اقبال کے حاضر باش دوستوں

[1] اکبر الہٰ آبادی: کلیات اکبر (کراچی، پنجاب پبلیشرز، س۔ن) ص۱۱
[2] حضورِ شاعر مشرق: ص۲۵
[3] کلیات اکبر الہ آبادی: ص۱۵۱

میں سے تھے۔اسی شمارے میں انھوں نے اقبال کی فارسی نظم ''عالمگیر'' کا اردو ترجمہ بھی کیا جو اقبال کو ان کی طرف سے خراجِ تحسین ہے۔اپنی ایک اور نظم ''پیام اقبال'' میں شاعر اور اقبال کے درمیان ایک مکالمہ پیش کرتے ہوئے اقبال کی زبانی یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

یہ جو نظر کے پاس ہے، یہ نہیں تیری کائنات
یہ جو خرد کا وہم ہے یہ نہیں حد ممکنات
وصل ہے شوق کا زوال، رہزن راہِ منزلیں
تیرا مقام بے سکوں، تیرا سفر تری حیات
راہ تو، راہبر بھی تو، نقش بھی، نقش گر بھی تو
تجھ سے شہودِ بیّنات، تجھ سے وجودِ ممکنات[1]

۸۔ حامد حسن قادری (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۴ء): نے خصائص و محاسن شاعری میں جن تین اردو شاعروں کا انتخاب کیا ہے ان میں اقبال کو برتر قرار دیا ہے اور ان کا انداز مدح و بیان بھی قابل تعریف ہے۔میرؔ و غالبؔ کے کمالات شعر کو کس خوبی سے اقبال کی ذات میں مجتمع دکھاتے ہیں: ؎

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے	جن کی فیض طبع نے اردو کو گنج زر دیا
اک اثر میں بڑھ گیا اک رفعت تخییل میں	تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائنات شاعری میں ہیں بس یہی دونوں کمال	تیسرے میں اس لیے دونوں کو یکجا کر دیا[2]

۹۔ حامد علی خان مولانا:۔(۱۹۰۰ء۔۱۹۹۵ء) جو مولانا ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی تھے، کو اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا بار بار موقع ملا۔حامد علی خان بھی اقبال کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔'' نیرنگِ خیال '' ۱۹۳۲ء میں ان کی نظم بعنوان ''اقبال'' شامل تھی۔ فرماتے ہیں: ؎

جنھیں رفعت سے آنکھیں تک ملانے کا نہ تھا یارا
انھیں پھر لے اڑی یہ کس کی تخییل سپہر آرا
نقیب آفتاب تازہ و تابندہ تر آیا
کہ ابھرا ہے افق سے پھر ترا ڈوبا ہوا تارا

---

[1] ذوالفقار احمد تابش (مرتب): نذر اقبال (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء) ص ۲۲۔۲۱
[2] نیرنگ خیال (۱۹۳۲ء) : ص ۳۶

فلک سے جا ملا پھر طاقِ قصرِ سطوتِ کبریٰ
ترا اقبال ہے اور ملتِ بیضا کا نقارا[1]

مولانا نے ہمایوں، مخزن اور الحمرا میں اقبال سے متعلقہ تحریروں کو ہمیشہ نمایاں جگہ دی۔

۱۰۔ حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۲ء):

شاعرِ شاہنامہ بھی اقبال کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ انھوں نے اقبال کو ان کی زندگی میں بھی سراہا اور موت کے بعد بھی انتہائی رقت آمیز نظم کہی۔ وہ اپنی نظم ''تین نغمے'' میں اپنی شاعری کو ٹیگور اور اقبال کے پہلو بہ پہلو رکھ کر دونوں کے اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ اس نظم کی ابتدا میں حفیظ خود کو تصادم اور کشمکش کی حالت میں محسوس کرتے ہیں۔ آغاز میں ٹیگور کا نغمۂ خواب آور اور نرم رو روشنی حفیظ کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن بالآخر وہ ٹیگور کے نغموں کو اقبال کی شاعری کے مقابلے میں پھیکا اور بے لطف محسوس کرتے ہوئے اقبال کی اطاعت کا اعلان کر دیتے ہیں:۔

اب یہ طوفانِ حیات افزا تھا میرے سامنے
نغمۂ اقبال کا دریا تھا میرے سامنے
میرا نغمہ نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا[2]

۱۰۔ حفیظ ہوشیار پوری (۱۹۱۲ء۔۱۹۷۴ء):

حفیظ ہوشیار پوری کی اقبال سے پہلی ملاقات ۱۹۳۱ء میں ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ حفیظ کو اقبال سے خاص ارادت تھی۔ ایک بار انھوں نے لوگوں سے سنا کہ اقبال کے فلسفے میں کوئی نئی بات نہیں ہے اور ان کے تمام افکار مغرب کے فلسفیوں سے مستعار ہیں تو بڑے برہم ہوئے اور فیصلہ کیا کہ مغرب کے فلسفیوں کے افکار اور اقبال کے نظریات کو تقابلی طور پر منظوم کریں گے۔ چنانچہ انھوں نے ''للحیات اور اقبال'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے پہلے حصے میں عزم للحیات اور دوسرے حصے میں اقبال کے عزم للحیات کے تصور کو پیش کیا اور اس کی نقل اقبال کو ارسال کی۔ اقبال نے ان کی نظم کی تحسین بھی فرمائی۔ اپنی ایک اور نظم میں اقبال کو یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:۔

سنائی اس طرح عہدِ کہن کی داستاں تو نے
کہ پیدا کر دیا اک تازہ و روشن جہاں تو نے

---

[1] نیرنگ خیال (۱۹۳۲ء) : ص۲۷۵

[2] حفیظ جالندھری: کلیات حفیظ (لاہور، الحمد پبلی کیشنز ۲۰۰۵ء) ص ۳۵۴

حرم میں جاگ اٹھا شیخِ حرم بھی خوابِ غفلت سے
بہ آہنگِ خودی جب بت کدے میں دی اذاں تو نے
سکھایا عشق کو انداز جینے اور مرنے کا
بنایا زندگی کو برتر از سود و زیاں تو نے
انھی کے زور بازو سے ہے اب گردش زمانے کی
بدل کر رکھ دیا آخر مزاجِ آسماں تو نے[1]

۱۱۔ سرور جہاں آبادی منشی درگا سہائے (۱۸۷۳ء۔۱۹۱۰ء):۔

اقبال کے عقیدت منداور پُر جوش شاعر تھے۔'' مخزن ''اگست ۱۹۰۶ء میں ان کی نظم ''قضائے برشکال اور پروفیسر اقبال'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔اس نظم کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ علامہ اقبال ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں قیام پذیر رہے۔اس اثنا میں شعروشاعری کی طرف ذرا کم توجہ رہی۔برعظیم میں آپ کے عقیدت مند شاعری سے آپ کی بے توجہی پر ملول تھے۔بعض احباب نے اس کم سخنی کی شکایت بھی کی۔آپ کی نظم کا موضوع بھی یہی ہے۔کہتے ہیں:۔

بہار آئی شگفتہ ہوئے گلِ پنجاب
چہک چہک کہ کدھر ہے تو بلبل پنجاب
ادھر بھی کوئی ایاغِ مئے سخن باقی
اٹھے وہ جھوم کے بادل ،گھٹا کے دن آئے
ترانہ سنج ہو، او، بلبل ریاض سخن
کہاں ہے تو کہ چمن میں فضا کے دن آئے
ترے بغیر ہیں مرغان نغمہ سنج خاموش
ترے بغیر ہے یاروں کی انجمن خاموش[2]

۱۲۔ سلام اللہ شائق مولوی:

اپنے وقت کے مشہور و بلند پایہ شاعر اور جید عالم دین مولوی شیخ عبداللہ کے بھتیجے تھے۔اقبال کے ان سے اچھے مراسم تھے۔جب ڈاکٹر محمد اقبال کو سرکا خطاب ملا تو مولوی سلام اللہ شائق نے اس خوشی میں مبارک باد کا قطعہ تاریخ لکھ کر پیش کیا۔

---

[1] نذر اقبال :ص ۲۸،۲۷

[2] ایضاً ص ۱۲

مبارک صد مبارک بہر اقبال — کہ از فضلِ خدائی لایزالی
عطا گردیدش از سرکارِ والا — بمطلب سر بہ سر فرخندہ حالی
نوشتم از سرِ اخلاص سالش
خطاب عزت و اقبال عالی[1]

۱۳۴۱ھ

۱۳۔ سید مقبول حسین رامپوری:

اعظم گڑھ سے شائع ہونے والے ''معارف'' مارچ ۱۹۳۲ء میں ان کی نظم ''اقبال اور ٹیگور'' شائع ہوئی۔ اس نظم میں ٹیگور کی زبانی اقبال کو یوں سراہتے ہیں:ـ

فرحت ہے روح کو ترے سچے پیام سے
اور دل میں لطف ہے ترے پیارے کلام سے
حق نے ترے کلام میں ایسا اثر دیا
مغرب کے دل کو جذبۂ مشرق سے بھر دیا[2]

۱۴۔ فیروز الدین طغرائی حکیم (۱۸۸۲ء۔۱۹۳۱):

حکیم فیروز الدین امرتسر کے رہنے والے تھے۔ اردو میں فیروزؔ اور فارسی میں طغرائیؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا تھا۔ اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے۔ اور اقبال کے کچھ عرصہ شعر ترک کرنے پر بہت آزردہ ہو کر یہ نظم کہی:ـ

امروز در فضائے زمیندار دیدہ ام
زاقبال پا سخے کہ دلِ آرزو بخست
خواہم کہ نکتۂ بہ سرائم دریں خصوص
ہر چند غم نوائے نشاط مراشکست
گیرم کہ گنجِ فلسفہ و حکمت است کس
اماچہ سود مہر سکوت ازلبش بہ بست[3]

اقبال نے عرشیؔ، طغرائیؔ اور مولانا ظفرؔ علی خان کے ان منظوم شکووں کے جواب میں اپنے شعری سکوت کو ترک کر دیا اور غزل کہی۔

---

[1] اوراق گم گشتہ : ص۱۱۰
[2] حضور شاعر مشرق :ص۱۹۸
[3] نذرِ اقبال :ص۱۲۷

۱۵۔ ظفؔر علی خان، مولانا (۱۸۷۰ء۔ ۱۹۵۶ء):

معاصر شعرا میں ظفؔر علی خان بھی قومی، ملی اور سیاسی و اسلامی شاعری میں اقبال سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اقبال سے اثر پزیری کی وجہ بتاتے ہوئے غلام حسین ذوالفقار نے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"اقبال اور ظفر کے شخصی و ادبی روابط کا سلسلہ بڑا جاندار تھا۔ اسلامی فکر و جذبے نے دونوں کے مقاصد میں یکسانی اور قلب و ذہن میں ہم آہنگی پیدا کر دی تھی"۔[۱]

مولانا نہ صرف اقبال کی شاعری سے متاثر تھے بلکہ شعر و سخن میں اقبال کی برتری کو تسلیم کرتے تھے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۱۲ء کے "زمیندار" میں سید حسن مرتضیٰ شفق عماد پوری کی ایک نظم اس موضوع پر شائع ہوئی کہ ہندوستان میں کوئی شیوا بیان شاعر موجود نہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے ان کے اس دعوے کی تردید کی اور علامہ اقبال کی ذات کو اپنے جواب کی محکم ترین دلیل کے طور پر پیش کیا۔ ظفر علی خان کہتے ہیں:

اقبال ہی کو لیجیے گر چاہیے مثال
جو نکتہ چیں کے زعم میں اہلِ زباں نہیں
اس کے کلام میں نہیں کیا سوز میؔر و دردؔ
یا غالبؔ و امیؔر کی رنگینیاں نہیں[۲]

۱۹۲۰ء میں علامہ اقبال نے شعر و سخن کے سلسلے میں سکوت اختیار کر لیا۔ آپ کے اس شعری سکوت نے آپ کے چاہنے والوں کو تڑپا دیا اور جو صاحبِ دل اور صاحبِ نظر آپ کی شاعری کے دلدادہ تھے، انھیں آپ کی خاموشی نے گویا ایک عظیم نعمت سے محروم کر دیا۔ اس موقع پر علامہ عرشؔی امرتسری نے ایک نظم کہی۔ عرشؔی کہتے ہیں:

اے ترنم ہائے رنگینت گلستان سخن
معنی عیسیٰ دمت، بخشندۂ جان سخن
لیکن اے اقبال این رنگین نوائی تا بکے
از نفس گرمی و از دل شعلہ زائی تا بکے
خیز وصوتِ خود بہ آہنگ رجز تبدیل کن
قطرۂ داری بیاور در شرر تحلیل کن[۳]

علامہ اقبال نے جب پڑھی تو بہت متاثر ہوئے اور اس کا منظوم ہی جواب تحریر فرمایا۔ اس پر روزنامہ "زمیندار" میں مولانا ظفؔر علی خان اور حکیم طغرائیؔ نے بھی منظوم تاثرات قلم بند فرمائے۔ مولانا ظفؔر علی خان کا محاکمہ ملاحظہ ہو:

۱۔ غلام حسین ذوالفقار: اقبال ایک مطالعہ، (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۸۷ء) ص ۱۷۴

۲۔ مولانا ظفر علی خان: نگارستان (لاہور مکتبہ کارواں، س۔ن) ص ۳۸۔۳۶

۳۔ نذرِ اقبال: ص ۱۲۲۔۱۲۳

بندہ نواز ہم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی
پیر فلک کی شعبدہ بازی کی بود و ہست
مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج
پیہم اتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست
لیکن نہ قولِ سعدیؔ شیراز بھولیے
"رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت
حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است"[1]

۱۶۔ محمد عبدالکریم قریشی:

گجرات کے مشہور عالمِ دین تھے اور اقبال کے ساتھ مل کر شمس العلماء عبداللہ ٹونکی سے حماسہ پڑھا کرتے تھے۔ بہت بعد میں مولوی عبدالکریم قریشی قلعداری علامہ سے ملنے گئے اور ایک قطعہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ فرماتے ہیں:

ای شیخ زماں محمد اقبال
اقبال تو یاورت بہر حال
باشی بحفاظت خداوند
با اہل و عیال و جملہ اطفال[2]

۱۷۔ عبداللہ عمادی (۱۸۷۷ء۔۱۹۴۷ء):

عبداللہ عمادی کی شخصیت علم و فضل، شعر و سخن اور ادب و تاریخ سے عبارت تھی۔ مولانا ظفر علی خان کے ساتھ "زمیندار" اور "ستارۂ صبح" کی ادارت کی اقبال سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور جب اقبال کی مثنوی "اسرار خودی" کی اشاعت پر مخالفت کا طوفان اٹھا تو عمادیؔ صاحب نے دل کھول کر اقبال کا ساتھ دیا اور اقبال کی حمایت میں مسلسل مضامین لکھے۔ ایک دفعہ علامہ اقبال نے مولانا عمادی کو لکھا کہ:

"اکبر الہٰ آبادی نے تو یہ کہا ہے:

کچھ الہٰ آباد میں سامان نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبر کے اور امرود کے

---

[1] نذرِ اقبال: ص۱۲۶

[2] اوراق گم گشتہ: ص۱۰۹

لیکن یہاں لاہور میں نہ تو اکبر ہیں نہ امرود، ایک اقبال ہے وہ بھی برائے نام!''

مولانا نے اس کے جواب میں نہایت برجستہ فرمایا:

تجھ پہ اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحور تہذیب فرنگ
تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے[1]

اقبال کے بارے میں کہے گئے مولانا عمادی کے ان اشعار کو زبردست خراجِ تحسین کیا جاسکتا ہے۔ یہ اقبال کی عظمت اور ہندوستان کی خوش بختی کا بلا مبالغہ اعتراف ہے۔

۱۸۔ عرشی امرتسری:

نے اقبال کے سکوتِ شعری کو توڑنے کے لیے ذیل کی نظم کہی جو زمیندار میں شائع ہوئی:

اے ترنم ہائے رنگینیِ گلستانِ سخن
معنی عیسیٰ دمت، بخشندۂ جانِ سخن
اے حیات تازہ دادی نغمہ را از نطق خویش
گشتہ ای شور افگن ارض و سما از نطق خویش
اے عروس طبع برما جلوہ ہا پاشیدہ ای
در چمن زار تکلم تازہ گل ہا چیدہ ای
یافت از تو مرکزے ہنگامۂ بے تاب ما
ریختی تخمِ سکوں در مزرعۂ سیماب ما
لیکن اے اقبال این رنگیں نوای تا بکے
از نفس گرمی و از دل شعلہ زائی تا بکے[2]

۱۹۔ فیض احمد فیض (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء):

فیض احمد فیض رومانوی اور ترقی پسند شاعر ہونے کے باوصف اقبال سے بہت متاثر تھے۔ ان کے کلام میں بھی اقبال کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اپنی نظم ''اقبال'' جو ''راوی گورنمنٹ کالج لاہور'' فروری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوئی، میں اقبال کی یوں تعریف و تحسین کرتے ہیں:

---

[1] معاصرین اقبال کی نظر میں :ص ۳۵۸

[2] ایضاً ص ۱۲۷

زمانہ تھا کہ ہر فرد انتظارِ موت کرتا تھا
عمل کی آرزو باقی نہ تھی بازوئے انساں میں
بساطِ دہر پر گویا سکوتِ مرگ طاری تھا
صدائے نوحہ خواں تک بھی نہ تھی اس بزم ویراں بھی

سنی و اما ندۂ منزل نے آوازِ درا آخر
ترے نغموں نے آخر توڑ ڈالا سحر خاموشی
مئے غفلت کے ماتے خوابِ دیرینہ سے جاگ اٹھے
خودآ گاہی سے بدلی قلب و جاں کی خودفراموشی

عروقِ مردۂ مشرق میں خون زندگی دوڑا
فسردہ مشتِ خاکستر سے پھر لاکھوں شرر نکلے
زمیں سے نوریان آسمان پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پایندہ تر، تابندہ تر نکلے

فروغِ آرزو کی بستیاں آباد کر ڈالیں
زجاج زندگی کو آتشِ دوشیں سے بھر ڈالا
طلسمِ کُن سے تیرا نغمۂ جانسوز کیا کم ہے
کہ تو نے صد ہزار افیونیوں کو مرد کر ڈالا[1]

جس طرح فیضؔ نے اقبالؔ کی زندگی میں انھیں شاندار خراجِ تحسین پیش کیا ان کی وفات کے بعد بھی جو نظم فیضؔ نے ان کی یاد میں لکھی اسے بحیثیت اسلوب وآہنگ تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

۲۰۔ فگار سیالکوٹی:

فگار سیالکوٹی کی نظم کے یہ اشعار'' نیــرنگ خیــال ''۱۹۳۲ء میں شائع ہوئے۔ وہ اقبال کی شاعری کو ''نغمہ داوٗد'' قرار دیتے ہیں اور انھیں ''حکیم روحِ ملت''، کہہ کر مخاطب کرتے ہیں: ؎

ازخمستان کہن جام شرابِ آوردۂ
نغمہ داوٗد از تار رباب آوردۂ
اے حکیم روح ملت از دوائے فلسفہ
دین ابراہیم را عہد شراب آوردۂ
ازرموز بیخودی سر خودی کر دی عیاں
ازسراب اے ابوالحکم دریائے آب آوردہ[2]

۲۱۔ شیخ غلام قادر گرامی (۱۸۵۷ء۔۱۹۲۷ء):

شیخ غلام قادر گرامیؔ جالندھر کے رہنے والے اور اگرچہ اقبال سے سن وسال میں بڑے تھے لیکن بہت گہرے اور

---

[1] راوی گورنمنٹ کالج، لاہور :فروری ۱۹۳۳ء (جلد نمبر ۲۷ شمارہ ۴) ص ۱۰،۹
[2] نیرنگ خیال ۱۹۳۲: ص ۳۵

بے تکلف دوست تھے۔ گرامی کے نام اقبال کے نوے خطوط بہ عنوان ''مکاتیب اقبال بنام گرامی'' (مرتب: محمد عبداللہ قریشی) اقبال اکادمی کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ فارسی زبان کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اقبال نے ان کی وفات پر مرثیہ بھی کہا۔ گرامی بھی اقبال کے چاہنے والوں میں تھے۔ انھوں نے اقبال کی تعریف میں جو تاریخی شعر کہے۔ انھیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

درس ماضی از کتابِ حال گیر
ساغر از خمخانہ اقبال گیر
حضرتِ اقبال آن بالغ نظر
دارد از بودو نبودِ ماخبر
مابہ ذوقِ سوختن کم ساختیم
بے خودی را از خودی نشناختیم
ازنوائش بزم یورپ درخروش
حکمت امریکہ اور راسفتہ گوش
نالہ ھائے آتشین آن حکیم
سوخت رخت فِتنۂ امیدو بیم
ساخت بادلھا وبودش ہیچ نیست
سوخت دل ہارا و دودش ہیچ نیست [۱]

۲۲۔ لمعہ حیدرآبادی:

لمعہ حیدرآبادی جن کا نام محمد عباس علی خان تھا، اقبال کے خاص عقیدت مندوں میں تھے۔ حضرتِ علامہ کو اپنا روحانی پیشوا مانتے تھے اوران کا کلام ہمیشہ مقدس آسمانی کتاب کی طرح باوضو پڑھتے تھے۔ علامہ اقبال کا کلام پڑھ پڑھ کر اکثر اشعار حفظ ہو گئے تھے۔ اس بنا پر کبھی کبھی وہ خود کو اقبال ہی خیال کرنے لگتے تھے۔ چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

شعر لکھ کر تو کبھی کہتا ہے میں اقبال ہوں
اور کبھی روتا ہے کہہ کر شامتِ اعمال ہوں [۲]

وقتاً فوقتاً اپنے اشعار بھی عقیدتاً علامہ کی خدمت میں روانہ کرتے تھے، جوان کی اقبال سے عقیدت اور خلوص پر مبنی ہوتے تھے۔ فرماتے ہیں:۔

---

[۱] نذر اقبال: ص ۷۰۔۱۶۹

[۲] معاصرین اقبال کی نظر میں: ص ۵۷۱

تو ہے شاہِ جہانِ بے نیازی
ہے عالمگیر تیری نے نوازی
ہیں نازاں تجھ پہ عطار و سنائی
مرید پیرِ رومی، مردِ غازی[۱]

مجھے اقبال سے حسنِ عقیدت ہوگئی جس دن
طبق گردوں کے میں نے بس اسی دن دیکھ ڈالے ہیں[۲]

اقبال تو سراپا اسرارِ ایزدی ہے
افسوں ترا تکلم، تو شعر کا دھنی ہے[۳]

۲۲۳۔ مخدوم محی الدین (پ ۱۹۱۰ء):

مخدوم محی الدین بھی اقبال کے نوجوان عقیدت مندوں میں شمار ہوتے تھے۔ حیدر آباد میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو اقبال ڈے منایا گیا۔ اس موقع پر انھوں نے اقبال کی شان میں نظم پڑھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس نظم کے دو شعر کافی عرصے تک حیدر آباد کی فضاؤں میں گونجتے رہے۔ وہ شعر یہ تھے:۔

نغمۂ جبرئیل ہے انسان کا گانا نہیں
صور اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں
حسن کی قندیل ہے اک آسمانی راگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے[۴]

اپنی ایک اور نظم بعنوان ''اقبال'' میں یوں اقبال کی تعریف میں مدح سرا ہیں:۔

مبارک ہو جہانِ شعر کی پیغمبری تجھ کو
ملی ہے شاعرانِ خوش نوا کی سروری تجھ کو
کہاں ہوتے ہیں تجھ سے اہلِ دل اہلِ نظر پیدا
کئے تیرے نگاہوں نے ہزاروں دیدہ ور پیدا

۱۔ معاصرین اقبال کی نظر میں: ص ۵۷۲۔۵۷۱
۲۔ ایضاً ص ۵۷۲
۳۔ ایضاً ص ۵۷۲
۴۔ اقبال کے ہم نشین: ص ۱۳۱

اسے کیا قحطِ مے ہو جس کی جانب چشم ساقی ہے
تجھے کیا غم ہے اے اردو ! ابھی اقبال باقی ہے[۱]

۲۴۔ مولانا محمد اسماعیل مغموم:

جنوبی ہند کے مشہور قومی کارکن اور معروف نعت گو شاعر اقبال سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اقبال ۱۹۲۸ء میں مدراس میں خطبات دینے کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا نے یہ نظم آپ کی آمد کی خوشی میں ایک خوبصورت تقریب میں پڑھی کہتے ہیں: ؎

سینہ جو ہے اقبال کا اک گنجِ نہاں ہے
اور کاشف اسرار و معارف یہ زباں ہے
افزوں ہے مزہ قند سے وہ لطفِ جہاں ہے
شائستہ و سنجیدہ بہم طبعِ رواں ہے
قرآن سے ہم آغوش تو سائنس سے قربت
ازبر ہے اسے فلسفہ وحکمت وہیت

اسی طویل مسدس میں آگے چل کر اقبال کے لیے یوں دعا گو ہیں: ؎

یا رب یہ حوادث سے جہاں کے ہو سلامت
افزوں ہو حیات اور ہو دار ین میں عزت
غم قوم کا کھاتا ہے تو ہو غم میں بھی لذت
آرام ملے سوز میں اور درد میں راحت
کیوں کر نہ محبت رہے اقبال کی دائم
ادنیٰ سا ہے مغموم بھی اک قوم کا خادم[۲]

۲۵۔ نادر کاکوروی (۱۸۶۷ء۔۱۹۱۲ء):

نادر کاکوروی نے رسالہ ''مخزن'' کے ذریعے شہرت اور ناموری حاصل کی اور اقبال کے بہت اچھے دوستوں میں شامل تھے۔ اقبال نے اپنی ایک غزل میں ان کا اور نیرنگ کا نام بہت محبت سے لیا ہے۔ اقبال کہتے ہیں: ؎

۱۔ حضورِ شاعرِ مشرق :ص۱۹۵
۲۔ نذر اقبال:ص۱۶۔۱۳

نادؔر و نیرنگ ہیں اقبالؔ میرے ہم صفیر
ہے اسی تثلیث فی التوحید کا سودا مجھے[۱]

نادؔر نے اقبال کی نظم ''شمع'' سے متاثر ہوکر نظم ''شمعِ مزار'' لکھی جس میں وہ اپنے آپ کو اقبال کی طرح دردمند ظاہر کرتے ہیں:۔

اس تیرہ روز گار و پر آشوب دور میں
دو تیرے درد مند ہیں اقبال اور میں[۲]

۲۶۔ ڈاکٹر سید یامین ہاشمی:

ڈاکٹر سید یامین ہاشمی، سندھ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے انھوں نے لندن سے پی۔ایچ۔ڈی کیا۔ وہ اپنی کتاب ''اقبال کی پیش گوئیاں'' میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں اقبال کی خدمت میں ایک نظم برائے اصلاح درج ذیل قطعے کے ساتھ ارسال کی تھی۔ اقبال کی تعریف یوں کرتے ہیں:۔

ڈاکٹر اقبال تو ہے ملہمِ رازِ حیات
واقف اسرار ہستی صاحب سازِ حیات
ہمت افزائے دل مسلم ہے تیری شاعری
پست ہمت بھی نظر آتے ہیں جانباز حیات
بادۂ عرفاں جو ساقی نے پلائی ہے تجھے
ہاشمی کو بھی چکھا دے وہ مئے رازِ حیات[۳]

۱۔ معاصرین اقبال کی نظر میں: ص

۲۔ نادر کاکوروی: جذباتِ نادر (کراچی، اردو اکادمی، سندھ، س۔ن) ص ۹۴۔۹۱

۳۔ اوراق گم گشتہ: ص ۱۸۶

فصل ششم:

یوم اقبال کی منظومات

لاہور میں اقبال ڈے ۷ ستمبر ۱۹۳۲ء

علامہ اقبال کی عظمت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ انھیں ان کی زندگی میں زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا اور ۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو باقاعدہ طور پر پہلا یوم اقبال منایا گیا۔ جناب رحیم بخش شاہین نے اپنی تالیف ''اوراق گم گشتہ'' میں مکمل تحقیق اور ثبوت کے ساتھ مورخہ بالا اقبال ڈے کو اولین اقبال ڈے قرار دیا ہے۔ اولین یوم اقبال منانے کا سہرا خواجہ عبدالوحید کے سر بندھتا ہے۔ اس جلسے کی کاروائی ۷ ستمبر ۱۹۳۲ کو روزنامہ ''انقلاب'' میں شائع ہوئی۔

پہلا یوم اقبال ۶ مارچ ۱۹۳۲ کو وائی ایم سی اے ہال میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام نہایت دھوم دھام سے منایا گیا۔ اگلے دن ۷ مارچ کو اسی یوم اقبال کے سلسلے میں حضرت علامہ اقبال کو دعوت چائے دی گئی۔ مجید سالک نے اسلامک یسرچ انسٹی ٹیوب کی طرف سے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور حضرت علامہ سے درخواست کی کہ وہ اس موقع پر خطاب فرمائیں۔ اقبال نے علم و تحقیق کی طرف ارکان انسٹی ٹیوب کی توجہ دلائی اور شکریہ ادا فرمایا۔

حیدر آباد میں اقبال ڈے:

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو اقبال کی زندگی میں ہندوستان بھر میں جشن اقبال منایا گیا۔ اس سلسلے میں حیدر آباد شہر میں زبردست تقریب ہوئی۔ علامہ کو حیدر آباد سے بحیثیت ایک مرکز اسلام اور اسلامی تہذیب کے گھوارے کے بہت لگاؤ تھا۔ یہ لگاؤ یک طرفہ نہیں تھا بلکہ اہل حیدر آباد کو بھی ان سے بے حد عقیدت تھی۔ یہ جلسہ ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو حیدر آباد کے سب سے بڑے باغ میں ٹاؤن ہال کی پرشکوہ عمارت میں منعقد ہوا۔ اس حوالے سے نواب مشتاق احمد خان لکھتے ہیں۔

> ''اس میں حاضرین اور اقبال کے مداحوں کی اس قدر کثیر تعداد تھی کہ یہ عظیم الشان عمارت بھی اپنی تنگ دامانی کی شکایت کرنے لگی۔ میں خود اس جلسے میں موجود تھا اور اس کا روح پرور نظارہ میری زندگی کی خوشگوار ترین یادوں میں سے ہے''۔[۱]

جواہر لعل نہرو نے اپنے پیغام میں کہا:

> ''اس حقیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس شاعرِ اعظم کے نغموں کی وجہ سے موجودہ نسل

---

۱ اقبال کے ہم نشیں :ص۳۰

زبردست متاثر ہوئی۔ اقبال کی خداداد قابلیت کا ہر شخص معترف ہے۔ جشن اقبال کی کامیابی کی توقع پر مسرت کا اظہار کرتا ہوں‘‘[۱]

پہلی نشست میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور اور سید ہاشمی فرید آبادی نے بڑے پر مغز مقالے پڑھے۔ دوسری نشست کی صدارت علامہ کے دوست مہاراجہ سرکشن پرشاد نے کی۔ اس میں اقبال کے مردِ مومن بہادر یار جنگ نے اقبال سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ اور ڈاکٹر یوسف حسین خان اور دیگر اہل علم نے مقالے پڑھے۔ اس موقع پر اقبال کو منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا گیا اور اقبال کے نوجوان عقیدت مندوں نے بڑی عمدہ نظمیں پڑھیں۔ نواب مشتاق احمد کہتے ہیں:

’’یوں تو ہر نظم بڑی معیاری تھی مگر مخدوم محی الدین کی نظم کے دو شعر ایک عرصہ تک حیدر آباد کی فضاؤں میں گونجتے رہے۔‘‘[۲]

شعر حسبِ ذیل ہیں:۔

نغمۂ جبریل ہے انسان کا گانا نہیں
صور اسرافیل ہے دنیا نے پہچانا نہیں
حسن کی قندیل ہے اک آسمانی آگ ہے
راگ کیا ہے سر سے پا تک عشق کی اک آگ ہے[۳]

لاہور میں اقبال ڈے ۱۹۳۸ء:

شہرِ لاہور میں بھی اقبال کی شاعری اور شخصیت بے پناہ مقبول و محبوب تھی۔ اور اقبال خود چونکہ لاہور ہی میں رہائش پذیر تھے اس لیے بھی اقبال کے تازہ ترین افکار اور اشعار عوام تک بہت جلد رسائی پاتے تھے اور اہل لاہور کے دلوں میں اقبال کی محبت کو دو چند کرنے کا سبب بنتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے انٹر کالجز کے طلبہ کی تنظیم دی انٹر کالجیٹ مسلم برادر ہڈ، نے ۱۹۳۸ء کے آغاز میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ کو ملک گیر اقبال ڈے منانے کی تحریک کا آغاز کیا۔ اس جلسے کی تفصیل اسلم جیراجپوری کی کتاب ’’نوادرات‘‘ میں مرقوم ہے۔ اس جلسے کی تین تین گھنٹے کی تین نشستیں رکھی گئیں۔ ملک کے طول وعرض سے عاشقانِ اقبال شرکت کرنے کے لیے لاہور پہنچے۔ پہلی نشست کی صدارت گوپی چند نارنگ نے کی دوسری نشست کی صدارت سر شیخ عبدالقدر نے کی اور تیسری کی صدارت علامہ عبداللہ یوسف علی نے کی بہت سے پر مغز مقالے پڑھے گئے۔ خاص طور پر خواجہ غلام السیدین، عابد علی عابد، پروفیسر عمر فاروق، پروفیسر منیر الدین اور چودھری غلام احمد پرویز کے مقالے بہت شوق سے سنے گئے۔ کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ جن میں اسدؔ ملتانی کی نظم خاص طور پر پسند کی گئی۔

---

۱ عبدالروف عروج: رجال اقبال (کراچی نفیس اکادمی، ۱۹۸۸ء) ص ۲۷۵

۲ اقبال کے ہم نشیں: ص ۱۳۱

۳ ایضاً ص ۱۳۱

اس نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

شاعروں سے ہے بہت اونچا مقام اقبال کا
کیونکہ ہم آہنگ قرآں ہے کلام اقبال کا
ذہن ہندی، علم افرنگی، نگاہِ یثربی
ہے محیط مشرق و مغرب نظام اقبال کا
خاکیوں میں کردیا ہے تازہ پھر عشقِ رسولؐ
قدسیوں کے دل میں بھی ہے احترام اقبال کا
اے اسدؔ محفل سہی کو تاہ دست و کم طلب
تندیٔ صہبا سے ہے گردش میں جام اقبال کا[1]

بمبئی میں یوم اقبال ۱۹۳۸:

لاہور کے انٹرمیڈیٹ کالجوں کے طلباء کی اپیل کے جواب میں بمبئی میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ کو یوم اقبال منایا گیا۔ضیاء الدین احمد برنی لکھتے ہیں:

''یہ دن سارے ہندوستان میں منایا گیا تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے حضور میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا جائے اور ان کی صحت کے لیے دعائیں مانگی جائیں اس جلسے میں جو کاؤسجی جہانگیر ہال میں منعقد کیا گیا تھا۔مسز نائیڈو نے بھی معرکتہ الآ راتقریر کی''۔[2]

مختصراً اقبال اس حوالے سے بہت خوش قسمت تھے کہ انھیں ان کی زندگی میں سراہا گیا۔عموماً اہلِ کمال اپنی زندگی میں کمال کی داد نہیں پاتے بلکہ ان کی زندگی آشفتہ حالی میں گزرتی ہے اور مرنے کے بعد لوگ ان کی عظمت کے قائل اور معترف ہوتے ہیں۔لیکن خود اقبال کی شاعری کی تاثیر اس قدر تھی کہ دوسروں کو متوجہ اور متاثر کیے بغیر نہ رہتی تھی۔یا یوں کہہ لیجئے کہ اقبال کی شاعری اس آفتاب نصف النہار کی مانند تھی جس کی تند و تیز روشنی نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی اور جس سے صرف نظر کرنا ناممکن تھا۔بقول صغرا ہمایوں مرزا:

''یہ اقبال کی اقبال مندی تھی جو ان کی زندگی میں یوم اقبال منایا گیا''۔[3]

---

[1] اقبالیات اسد ملتانی: ص ۹۹۔۹۸

[2] اقبال کے ہم نشین: ص ۷۱

[3] ایضاً، ص ۶۲

باب سوم:

منظوم خراجِ عقیدت بعداز وفات

فصل اول: اقبال کی وفات، اخبارات ورسائل کا ردِ عمل تعزیتی پیغامات

فصل دوم: اقبال کی وفات پر کہا گیا پہلا مرثیہ

فصل سوم: برعظیم پاک وہند کے شعرا کا اپنی نظموں میں اظہارِ غم

فصل چہارم: اہلِ عرب شعرا کا منظوم خراجِ عقیدت

فصل پنجم: ایران کے شعرا کا خراجِ تحسین

فصل ششم: منظوم خراجِ تحسین کا منفرد انداز ــــــ تقلید اقبال

فصل اول:

اقبال کی وفات، اخبارات ورسائل کا ردِعمل ___ تعزیتی پیغامات

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح ساڑھے پانچ بجے علامہ اقبالؒ کا انتقال ہوگیا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون** ٭ یہ دل شگاف خبر سرعت کے ساتھ پورے شہر میں پھیل گئی۔ تمام اسلامی حلقوں میں ماتم کے طور پر دکانیں بند ہوگئیں۔ لوگ جوق در جوق مرحوم کی کوٹھی کی جانب روانہ ہوئے۔ تدفین کے لیے علامہ اقبال کے شایانِ شان شاہی مسجد کا احاطہ قرار پایا اقبال کی جدائی کے رنج وغم میں مبتلا ہزاروں سوگوران نے ان کے جنازے میں شرکت کی۔ ان میں ہائی کورٹ کے جج ،سرکاری اعلیٰ افسران اور عمائدینِ شہر غرض سبھی لوگ شامل تھے۔ جنازہ ۲۲ اپریل کو صبح ۵ بجے ان کی جائے رہائش میورو ڈ سے اٹھایا گیا۔ جنازے کے آگے مسلم لیگ کا ہلالی پرچم تھا اور سوگوار بلند آواز سے کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ نماز جنازہ میں دس ہزار سے زائد افراد شریک تھے۔

ہندوستان بھر کے اخبارات وجرائد نے اقبال کی وفات کی خبروں، ان کی شخصیت وشاعری، ان کی وفات پر ملنے والے تعزیتی پیغامات، مرثیوں اور قطعاتِ تاریخ وغیرہ کو اپنے صفحات میں خصوصی جگہ دی۔

روزنامہ ”سول اینڈ ملٹری گزٹ“ لاہور نے بابت ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ میں علامہ اقبال کی رحلت پر مفصل رپورٹ شائع کی۔ جس کا ترجمہ بعد ازاں ہفت روزہ چٹان لاہور مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء میں ”ھمدرد ڈائجسٹ“ کے حوالے سے شائع ہوا:

> ”مشہور ومعروف فلسفی اور شاعر ڈاکٹر محمد اقبال کل صبح اپنی جائے رہائش میورو ڈ پر انتقال فرما گئے۔ ان کی عمر ۶۱ برس تھی۔ آخری الفاظ جو سر محمد اقبال کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے ”الحمد اللہ کہ میں مسلمان ہوں اور مسلمان موت سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوتا۔ میں خندہ پیشانی سے اسے لبیک کہوں گا“۔
>
> مرحوم کے پس ماندگان میں ایک چھ سالہ بیٹی اور دو صاحبزادے شامل ہیں۔۔۔ مرحوم کی تجہیز وتکفین کے انتظامات کیے جارہے ہیں۔ جنازہ میورو ڈ سے اٹھایا جائے گا۔ بادشاہی مسجد کی سیڑھیوں کے قریب پہلو میں ایک سبزہ زار کے اندر میت کو دفنایا جائے گا جس کے لیے بااختیار حکام سے خصوصی اجازت حاصل کرلی گئی ہے“[۱]

۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کے ”منادی“ میں آپ کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے خواجہ حسن نظامی نے جو کچھ لکھا۔ اس کے حرف حرف سے درد وغم کا اظہار ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

---

[۱] اوراق گم گشتہ: ص ۲۰۴

''آج ۲۱ اپریل کی صبح کو دلی ریڈیو نے یہ المناک خبر سنائی کہ تمام اسلامی دنیا کے مسلّمہ قومی شاعر نے جنھوں نے ساری اسلامی دنیا میں ترقی و زندگی کی لہر پیدا کر دی، اس دنیا سے انتقال فرمایا۔ یہ خبر نہ صرف دنیا بھر کے مسلمانوں کو غمگین کرنے والی ہے بلکہ تمام ایشیائی قوموں کو اس کا صدمہ ہوگا کیونکہ مرحوم ایشیا کی پرانی تہذیب کے حامی اور مددگار تھے، اس لیے ان کی وفات سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ مرحوم کا دلدادہ حسن نظامی''[۱]

روزنامہ ''انقلاب'' مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۳۸ء میں مولانا غلام رسول مہر، شارح اقبال نے اقبال کی وفات پر اپنے جذبات کا بے ساختہ اظہار کرتے ہوئے کہا:

نذر اشک بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

حضرت علامہ اقبال اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے بقا صرف اللہ کی ذات کے لیے ہے آج پہلو میں دل نہیں بلکہ یاس وحسرت کا ایک ٹکڑا ہے جو ابھی تک اپنی سوگواری کی وسعت کا صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکا بار بار سوال پیدا ہوتا ہے:

جس کے آوازے سے لذت گیر اب تک گوش ہے
وہ جرس کیا اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

در و دیوار سے اس سوال کا صرف ایک جواب ملتا ہے:

ع رولے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوننابہ بار

اب احباب کے گلے مل کر رو لینے کے سوا اور کیا باقی ہے؟[۲]

اقبال کی وفات کے فوراً بعد کلکتہ میں پارک سرکس کے مقام پر دس ہزار سے زیادہ مسلمانوں کے اجتماع میں علامہ کی وفات پر قرار داد تعزیت منظور کی گئی جس میں ان کی وفات پر دلی صدمہ کا اظہار کرتے ہوئے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرنے کی دعا کی گئی اس موقع پر علامہ اقبال کو ہدیہ عقیدت پیش کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح نے کہا:

''سر محمد اقبال اسلام کے قابلِ احترام فرزندوں میں سے ایک تھے۔ وہ خدا شناس، درویش، فلسفی اور مفکر تھے۔ ایک عملی سیاست دان کے لحاظ سے بھی وہ کچھ کم حیثیت کے مالک نہ تھے۔ بے شک وہ ایک عظیم محبِّ وطن تھے اور آج ہندوستان کی ایک عظیم ترین ہستی، ہم سے جدا ہو گئی''[۳]

---

۱ معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۴۳۷

۲ نقوش: اقبال نمبر ۷، جلد دوم (لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۷۷ء) ص ۲۵۳

۳ اوراق گم گشتہ: ص ۴۰۷

لاہور سے مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان نے بھی مرحوم کی یاد میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا۔اس موقع پر بنگال کے ہوم منسٹر سر ناظم الدین نے کہا:

''سر محمد اقبال ہمیں ایسے نازک وقت میں داغِ مفارقت دے گئے ہیں جب کہ ہمیں ان کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت تھی۔ان کی وفات سے ہندوستان اپنے ایک عظیم ترین فلسفی اور مفکر سے اور اسلام اپنے ایک ایسے ہونہار فرزند سے جس کا نام تاابد روشن رہے گا۔آج محروم ہو گیا ہے''[۱]

اقبال کی وفات پر ہندوستان کی ممتاز و معروف شخصیات نے تعزیتی پیغامات اخبارات و رسائل کو بھجوائے۔ان شخصیات میں محمد علی جناح، جواہر لال نہرو، ٹیگور، سر تیج بہادر سپرو، بہادر یار جنگ، مولانا عبدالماجد دریا بادی، عبدالرحمٰن چغتائی، سر سکندر حیات خان، سر سلطان احمد اور مسٹر محمد یونس سابق وزیر اعظم بہار کے نام نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔
ان پیغامات میں بھی اقبال کی شخصیت اور ان کی شعری عظمت کو سراہا اور اعتراف کیا گیا۔ان پیغامات میں کہا گیا کہ اقبال کی وفات سے ہندوستان ایک شان دار اور درخشاں ستارے سے محروم ہو گیا۔اقبال کی وفات نے اردو ادب میں ایسی جگہ خالی کر دی ہے کہ ایک کاری زخم کی طرح اس کے مندمل ہونے کے لیے ایک نہایت طویل عرصہ درکار رہے۔اقبال ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا۔اقبال کے دوست اور معروف سیرت نگار سید سر سلیمان ندوی نے اقبال کی وفات پر نہایت رنجیدگی کے عالم میں بالکل درست فرمایا تھا کہ:

''ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفہ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خوان صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو''[۲]

---

۱ اوراق گم گشتہ :ص ۴۰۷

۲ تاج: اقبال نمبر، جولائی ۱۹۳۸ء، لاہور، ص ۷

فصل دوم:

اقبال کی وفات پر کہا گیا پہلا مرثیہ

اقبال کی وفات پر لکھے جانے والے دردانگیز مراثی کی تعدادیوں تو سیکڑوں تک جا پہنچتی ہے۔ کیونکہ اقبال ہندوستان کے شعرا کے لیے ایک آفتابِ عالم تاب کی مانند تھے۔ جس کی ضو سے ہر شخص اپنی قابلیت اور استعداد کے مطابق نور حاصل کرتا تھا۔ اقبال کی وفات سے ان شعرا کی ذات کو ایک زبردست دھچکا لگا۔ اور ان کی شاعری آہ و فغاں کی تفسیر بن گئی۔ تاہم جب ہم تحقیقی اعتبار سے اقبال کے پہلے مرثیے کا سراغ لگاتے ہیں تو ہمارے سامنے اکبر لاہوری کا ''مرثیہ اقبال'' آتا ہے۔ جس کے بارے میں وہ خود رقم طراز ہیں:

''جب علامہ اقبال کی وفات کی خبر شہر میں پھیلی تو سرکاری دفاتر اور کاروباری ادارے بند ہونا شروع ہو گئے۔ راقم بھی فوراً ان کی کوٹھی واقع میورو ڈ (حال علامہ اقبال روڈ) پہنچا۔ ہم لوگوں کے پہنچنے سے پہلے شاعر کو کفنا کر جنازہ تیار کیا جا چکا تھا۔ چہرہ کھلا تھا تا کہ لوگ زیارت کر سکیں۔ لوگ پورچ کے ایک رخ سے داخل ہو، زیارت کر کے دوسری طرف نکلتے جاتے۔ آخری زیارت کرنے والوں میں راقم بھی تھا۔ میرے اس وقت کے تاثرات یہ تھے کہ وہ محشرستانِ قلم یکا یک خاموش ہو گیا ہے۔ اس سے دل کو ایک دھچکا لگا اور فوراً یہ شعر منہ سے نکلا:۔

آج وہ مردِ خوش بیاں چپ ہے
جس کی چپ سے بس اک جہاں چپ ہے

باقی شعر جنازے کے ساتھ چلتے ہوئے ہو گئے جب شاہی مسجد کی سیڑھیوں میں قبر کو مٹی دے چکے تو یہ نظم بھی مکمل ہو چکی تھی''[1]

ذیل میں اس مرثیے کے چند بند شعر درج کیے جاتے ہیں:۔

فلسفے کا دماغ مختل ہے
شاعری مہر بر زباں چپ ہے
بزم الفت میں ہو کا عالم ہے
ایک شوریدہ داستاں چپ ہے
محفل نعت ہو گئی سُونی
کہ محمدؐ کا مدح خواں چپ ہے
روشنی کو زوال ہے اکبر
کہ وہ شیدائے داستاں چپ ہے[2]

---

[1] حضور شاعرِ مشرق، ص۲۳

[2] ایضاً ص۲۳

جناب اکبر لاہوری کے بیان کے مطابق انھوں نے یہ مرثیہ اقبال کی تدفین کے موقع پر کہا۔ اور اقبالؒ کی تدفین ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو عمل میں آئی۔ اس اعتبار سے یہ مرثیہ بھی ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو کہا گیا۔ ۲۲ اپریل کو کہے جانے والے مرثیے اکبر لاہوری کے علاوہ حسرت موہانی اور اسدؔ ملتانی کے بھی دستیاب ہیں۔ اس لحاظ سے اس امر کا طے کیا جانا کہ اولین مرثیہ کس شاعر کا ہے، مشکل ہے۔ مولانا حسرتؔ موہانی نے ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال کے نام جو تعزیت نامہ بھیجا اس میں بھی انھوں نے اقبال کی یاد میں نہایت دلگداز شعر کہے ہیں۔ ذیل میں وہ خط درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

کان پور۔ مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۳۸ء

عزیزی!

السلام علیکم۔ آج کے اخباروں میں اقبال مرحوم کے انتقال پر ملال کا حال پڑھ کر جس قدر صدمہ ہوا اس کا اظہار بذریعہ الفاظ نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

اپریل ۱۹۳۷ء میں بیگم حسرت موہانی کا انتقال ہوا تھا، اس سانحہ ہوشربا کے بعد فقیر کا دل مشغلۂ شعر وسخن سے سرد ہو چکا تھا کہ اب اقبالؔ کے اس حادثۂ عظیم نے بے دلی وافسردہ مزاجی کی تکمیل کر دی۔

انا للّٰہ وانّا الیہ راجعون ٥

غمزدہ

حسرت موہانی

اس مکتوب کے ساتھ ذیل کے اشعار بھی ارسال تھے۔ اس نظم کا عنوان بھی حسرت نے اپنے غم کے بموجب ''اشکِ خونیں'' رکھا ہے۔ کہتے ہیں: ؎

عاشقی کا حوصلہ بیکار ہے تیرے بغیر
آرزو کی زندگی دشوار ہے تیرے بغیر
کاروبارِ شوق کی اب وہ تن آسانی کہاں
دل پہ ذوق شاعری اک بار ہے تیرے بغیر
شرکت بزمِ سخن سے بھی ہمیں باوصف عزم
بر بنائے بے دلی انکار ہے تیرے بغیر
دردِ دل جو تھا کبھی وجہ مباہات وشرف
بہر حسرت موجب صد عار ہے تیرے بغیر[1]

---

[1] غلام سرور نگار، چودھری (مرتب): یادِ اقبال (لاہور۔ اقبال اکادمی، س۔ن) ص ۳۶

حسرتؔ موہانی کے ان دردانگیز اشعار کے علاوہ ہمارے سامنے اسدؔ ملتانی کا ایک طویل مرثیہ بھی آتا ہے جو اقبال کی وفات کے فوراً بعد کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ مرثیہ ترکیب بند ہے۔ اور اس کے دیباچے پر جو غلام احمد پرویز کا تحریر کردہ ہے، تاریخ یکم جون ۱۹۳۸ء ہے، تاہم اس مرثیے کا پہلا بند یہ ظاہر کرتا ہے کہ اقبال کی وفات کی اطلاع ملتے ہی لکھا گیا۔ اس لحاظ سے امکان غالب ہے کہ اسد ملتانی کا مذکورہ بالا مرثیہ بھی ۲۱ یا ۲۲ اپریل ہی کو لکھا گیا ہے۔

مرثیے کا پہلا بند ملاحظہ ہو:

الٰہی کیسی قیامت کی یہ سحر آئی
جو آج رحلتِ اقبال کی خبر آئی
وفاتِ شاعرِ مشرق کی اطلاع ملی
کہ روح و قلب میں برقِ بلا اتر آئی
زمانہ ہو گیا آنکھوں میں ایسا تیرہ و تار
کہ زندگی میں جھلک موت کی نظر آئی
خدا کرے کہ غلط ہو یہی تھی خواہش دل
خبر اگرچہ نہایت ہی معتبر آئی
ہزار حیف دعا کوئی کارگر نہ ہوئی
دعا فلک پہ گئی اور بے اثر آئی
ہمارا گنجِ گراں مایہ اس کے ہاتھ لگا
لٹے جو ہم تو قضا کی مراد بر آئی
سیاہ روز ہوئی آج ملتِ بیضا
کہ شامِ غم سے بھی اک تیرہ تر سحر آئی
امام فلسفہ و شاعری کا ماتم ہے
مہِ صفر بھی ہمارے لیے محرم ہے[1]

مذکورہ بالا بند کے ایک ایک مصرعے سے اسدؔ ملتانی کے جذباتِ غم جس شدت سے عیاں ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہی امکانِ غالب نظر آتا ہے، کہ اسدؔ ملتانی نے یہ اشعار اقبال کی وفات کے فوراً بعد لکھے ہوں گے۔ اس مرثیہ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی دو چند ہو جاتی ہے کہ اقبال کی وفات کے فوراً بعد لکھے جانے والے مرثیوں میں سے اسدؔ ملتانی کا مرثیہ طویل ترین مرثیہ کہلانے کا حقدار ہے۔ اس ترکیب بند مرثیے میں اسدؔ ملتانی اقبال کو امام فلسفہ و شاعری، پیغمبر بہار،

---

[1] اقبالیاتِ اسد ملتانی : ص۱۰۲۔۱۰۰

نوائے فطرت پر غالب آنے والا زمزمہ پرداز، شاعرِ حیات، آفتابِ مشرق، ترجمانِ حقیقت جیسے القابات سے یاد کرتے ہوئے ان کی مختلف خدمات اور حیثیات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ لیکن اس شدید غم کے باوجود اسدؔ ملتانی نے رونے رلانے کو اپنا مقصد قرار نہیں دیا بلکہ نظم کے آخر میں پیغام حرکت و عمل دے کر مرثیہ کو نعرۂ جہاد میں ڈھال دیا ہے۔ کہتے ہیں: ؎

اٹھو مقابلۂ گردش زمانہ کریں
حیات و موت کو پابستۂ قضا نہ کریں
فنا یہی ہے کہ دل میں نہ ہو یقینِ بقا
بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں
اسی سے ملتِ خوابیدہ جاگ اٹھے شاید
وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں[1]

---

[1] اقبالیات اسد ملتانی: ص ۱۱۰

فصل سوم:

برعظیم پاک وہند کے شعرا کا اپنی نظموں میں اظہارِ غم

برعظیم پاک وہند کے شعرائے کرام نے اقبال کی اس اچانک جدائی کو بہت محسوس کیا۔اور یہ شدید غم ان کی شاعری میں اقبال کی یاد میں لکھے جانے والے مراثی ،قطعات اور نظموں کے ایک انبار کی صورت میں ظاہر ہوا۔اقبال کی وفات سے لے کراب تک جو نظمیں اقبال کی یاد میں لکھی گئیں،تعداد کے اعتبار سے ہزاروں تک جا پہنچتی ہیں۔نظموں کے اس بحرِ بیکراں کا تجزیہ کرنا کارِ ناممکن نہ سہی ،کارِ دشوار ضرور ہے۔تاہم ذیل میں اقبال کے متعلق لکھی جانے والی چند اہم اور نمایاں نظموں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ان نظموں میں ہم اقبال کے ہم عصر شعرا کی نظموں کو اولیت کا درجہ دیتے ہوئے ان سے بحث کریں گے۔یہاں ہم نے ان شعرا کی ترتیب حروفِ تہجی کے اعتبار سے قائم کی ہے:

۱۔ احسان دانش (۱۹۱۴ء۔۱۹۸۲ء):

احسان دانش بھی اقبال کی شاعری سے متاثر تھے۔اور اقبال کو سراہنے کا انداز ان کے یہاں شاعری میں اقبال کی تقلید کی صورت میں نظر آتا ہے۔انھوں نے غریبوں،مزدوروں،محنت کشوں،کسانوں اور بیواؤں کی حمایت میں جو نظمیں لکھی ہیں،ان میں اقبال کی روشن کی ہوئی شمعوں کی روشنی ہے۔اقبال کی شان میں اپنی ایک بہت خوبصورت نظم بعنوان ''حضرتِ اقبال''میں شاعرانہ انداز میں اقبال کی شخصیت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں:ے

وہ ایک چشمہ جو اترا تھا کوہساروں سے
وہ اک شرار جو پھوٹا تھا سنگ پاروں سے
وہ اک دیا جو جلا شب نما سویروں میں
وہ اک کرن جو ہنسی منجمد اندھیروں میں
وہ ایک صاحبِ منزل جو کارواں میں نہیں
وہ اک لطافتِ عنواں جو داستاں میں نہیں
وہ رند جب سے خراباتِ زندگی میں نہیں
خودی کا ذکر کہیں شہرِ بے خودی میں نہیں[1]

۲۔ احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء):

معروف شاعر،نقاد اور افسانہ نگار بھی اقبال کی عظمتوں کے معترف ہیں۔ان کی شاعری پر بھی اقبال کے گہرے اور نمایاں اثرات ہیں۔اقبال کی تعریف میں اپنی نظم ''بخدمتِ اقبال''میں یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:ے

---

[1] بیادِ شاعرِ مشرق : ص۲۸

جانتے ہیں جو سمجھتے ہیں ترے فن کی زباں
تو نے دی روح کے کعبے میں محبت کی اذاں
مجھ کو اکثر ترا ارشاد ہی یاد آتا ہے
عشق کی شانِ حمیت کا چھڑے ذکر جہاں
رومی و سعدی و غالب میں تری گونج سی ہے
جیسے صدیاں تجھے پانے میں رہیں سرگرداں[۱]

کہتے ہیں کہ جب میرے جیسا شاعری کا دعویٰ دار شعر کہتا ہے تو اسے تیرا یہ فرمان یاد آتا ہے:۔

برکش آن نغمہ کہ سرمایۂ آب وگل تست
ای زخود رفتہ، تہی شوز نوائے دگراں[۲]

۳۔ اداؔ جعفری (۱۹۲۴ء پ):

معروف شاعرہ اداؔ جعفری اقبال کے فکروفن سے متاثر ہیں۔اقبال کے بارے میں لکھی گئی ان کی نظم اقبال سے ان کی عقیدتوں اور محبتوں کی بھرپورتر جمانی کرتی ہے۔نظم بہت خوبصورت اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اداؔ جعفری کی مذکورہ نظم اقبال کے متعلق لکھی جانے والی چند خوبصورت ترین نظموں میں سے ایک ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ فرماتی ہیں:۔

پاس ادب سے تجھ کو سخنور نہ کہہ سکوں
تو وہ سفیر درد مسیحا کہوں تجھے
حسن نظر کہ عین نظارا کہوں تجھے
اقبال ! کائنات تمنا کہوں تجھے
دل ہی نہیں جسے دلِ مضطر نہ کہہ سکوں
کانوں میں گونجتی ہے صدائے درا ابھی
آئینے دے رہے ہیں تجھے راستا ابھی
روشن ہیں سنگ رہ پہ ترے نقش پا ابھی
رہرو نہیں ہوں گر تجھے راہبر نہ کہہ سکوں[۳]

۱۔ بیاد شاعرِ مشرق : ص۳۲

۲۔ ایضاً ص۳۲

۳۔ امجد اسلام امجد (مرتب): اقبال کی یاد میں (لاہور پنجاب آرٹ کونسل، ۱۹۷۷ء) ص۴۷

ادا کہتی ہیں کہ اے اقبال تری سانسوں کی خوشبو آج بھی ہوا میں ہے۔ صبا تیری سحر کا رنگ تلاش کرتی ہے، تیرا چراغ آج بھی دستِ دعا میں ہے۔ اے اقبال تو ایسا صاحبِ جنوں ہے جس پر خود جنوں کو ناز ہے۔ ترے معبد فسوں پر خود شوق سجدہ کرتا ہے۔ اور نظم کے آخر میں بڑے ہی دلکش انداز میں خلاصہ پیش کرتی ہیں: ۔

اے دشت زندگی میں دل آرزو پناہ
ہر ایک کا نصیب کہاں ہے تری نگاہ
تری نگاہ پہ فاش ہوا سرِ لا الٰہ
بے شک زباں سے تجھ کو پیمبر نہ کہہ سکوں[1]

۴۔ امیںؔ حزیں سیالکوٹی (۱۸۸۴ء۔۱۹۶۸ء):

امیںؔ حزیں جو معروف شاعر اثر صہبائیؔ کے بڑے بھائی تھے۔ فکرِ اقبال سے صرف متاثر ہی نہ تھے۔ بلکہ اقبال کے شاعری میں پیروکار اور مقلد بھی تھے۔ ساری عمر اقبال کے رنگ میں شعر کہتے رہے۔ اپنی نظم ''اقبال'' میں کہتے ہیں: ۔

مئے باقی کا جام تھے اقبالؔ
زندگی کا پیام تھے اقبالؔ
مومنوں کے امام تھے اقبالؔ
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے
قلزمِ علم کے شناور تھے
حکمت نادرہ کے دفتر تھے
ان کے جوہر عجیب جوہر تھے
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے
پیرِ ہندی ترا نیاز آگیں
تیرا شیدا ترا امیںؔ حزیں
نوحہ گر کیوں نہ ہو بصدق و یقیں
ہائے کیا چیز چھن گئی ہم سے
رحمت ذوالجلال تھے اقبالؔ
آپ اپنی مثال تھے اقبالؔ[2]

---

[1] اقبال کی یاد میں :ص۷۳

[2] معاصرین اقبال کی نظر میں:ص۵۳۹۔۵۳۸

۵۔ حامدؔ حسن قادری (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۴ء):

حامدؔ حسن قادری نے بھی جو مشہور ادیب وشاعر و تاریخ گو ہیں۔اقبال کی یاد میں اسی بحر میں غزل کہتے ہوئے آخر میں تاریخ وفات بھی نکالی۔فرماتے: ۔

برفت اقبالِ ہند و شرق و اسلام
شکوہ رفتہ باز آید کہ نا ید
برفت اقبال و رفت از جاں قرارے
قرار جاں نواز آید کہ ناید
برفت اقبال واز قوم آن وشان رفت
دگر آن جلوہ ساز آید کہ ناید[۱]

اور تاریخ کچھ اس طرح کہتے ہیں: ۔

زشعرش ساخت حامدؔ سال رحلت
بشانِ امتیاز آید کہ نا ید
برفت اقبال آن عرفان نوائے
۶۰۳
دگر دانائے راز آید کہ نا ید[۲]
۱۹۳۸ء=۱۳۳۵+۶۰۳

۶۔ حامد علی خان (۱۹۰۰ء۔۱۹۹۵ء):

ہمایوں، مخزن اور الحمرا کے مدیر، مولانا ظفر علی خان کے چھوٹے بھائی اور کہنہ مشق شاعر بھی اقبال کی شخصیت سے بہت متاثر تھے۔آپ کو اپنے بچپن میں اقبال سے بارہا ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا۔''محمد اقبال'' کے عنوان سے اپنی نظم میں علامہ اقبال کو اس طرح خراج تحسین پیش کرتے ہیں: ۔

فنا پر خندہ زن اقبالؔ عالی گوہری تیری
کہ ہے صورت نما اللہ کی صورت گری تیری
رسول اللہ کے پیغام کی تفسیر کی تو نے
چلی ختم الرسلؐ کے بعد بھی پیغمبری تیری[۳]

[۱،۲] اردو: اقبال نمبر،ص ۱۲

[۳] بیادشاعر مشرقِ : ص ۹۴

۷۔ حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۲ء):

اقبال نے حفیظ سے خود اپنا مرثیہ لکھنے کو کہا۔ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

''بعدازاں ایک دن آیا کہ علامہ نے مجھے جالندھر سے علی بخش کو بھیج کر بلوایا۔ میں حاضر ہوا تو آپ دردِ گردہ میں مبتلا تھے۔ اور بہت ہی بیمار۔ مجھے دیکھتے ہی کراہتے ہوئے بولے۔ آ گئے حفیظ جی! بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا تو فرمایا ''یہ دردگردہ شاید میری جان لے کر رہے'' پھر کہا: ''حفیظ تم میرا مرثیہ لکھنا''۔ یہ سن کر میری چیخیں نکل گئیں۔ عرض کیا میری اور مجھ ایسے ہزاروں کی جانیں خدا آپ کی عمر میں جوڑ دے گا''۔[1]

اقبال کی وفات کے بعد لکھے گئے اپنے مرثیے ''اقبال بلند ہو گیا ہے'' میں اقبال کی زندگی اور وفات دونوں کو مثالی قرار دیتے ہوئے اپنے لیے پند خیال کرتے ہیں۔ کہتے ہیں: ؎

غم حوصلہ مند ہو گیا ہے
دل صبر پسند ہو گیا ہے
انداز حیات و مرگِ اقبال
میرے لیے پند ہو گیا ہے
دنیا میں بڑا تھا اس کا رتبہ
عقبیٰ میں دو چند ہو گیا ہے
اقبال بلند تھا ہمارا
اب اور بلند ہو گیا ہے[2]

اقبال کے ۹۹ ویں یوم ولادت منعقدہ ۹ نومبر ۱۹۷۶ء کو حفیظ نے مرکزی مجلسِ اقبال کی تقریب میں اقبال کی شان میں ایک اور نظم پڑھی۔ اپنی اس نظم لعبنوان ''اقبال'' میں حفیظ اقبال کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اقبال کو اپنا راہبر قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ؎

قلبِ ہر مومن میں جو تصویر ہے اقبال ہے
جس کا نطق اسلام کی تفسیر ہے اقبال ہے
عاشقِ صادق رسول اللہ کا اقبال ہے
پیکر پر سوز اشک و آہ کا اقبال ہے

---

[1] مضمون ''حفیظ کا اقبال'' از حفیظ مشمولہ (نقوش اقبال نمبر۲، ۱۹۷۷ء) : ص ۴۶۶

[2] کلیات حفیظ: ص ۵۸۰

طالب حق پر ہے لازم اتباع مصطفیٰ
آج مجبر اس نشانِ راہ کا اقبالؔ ہے
رحمتہ اللعالمیں کے فیضِ نسبت سے حفیظؔ
میں بھی ہوں راہی، مرا بھی راہبر اقبالؔ ہے[۱]

۸۔ حفیظؔ ہوشیارپوری (۱۹۱۶ء۔۱۹۷۳ء):

اقبال کے زبردست مداح تھے۔اقبال کی شان میں انھوں نے چار نظمیں بعنوان ''آہ اقبال''، ''اقبال''، ''نالۂ پابندنے''، اور ''پیغمبر دین خودی'' لکھیں۔ان نظموں میں ''نالۂ پابندنے'' ان کا طویل ترین مرثیہ ہے جس کا آغاز میں وہ اقبال کی وفات سے اپنے تہی داماں ہونے پر نوحہ کناں ہیں۔فرماتے ہیں کہ اہلِ کارواں کدھر کا رخ کریں، جبکہ بانگ درا گم ہو، جب وہ ساقیٔ بزم خودی چلا گیا تو میخانہ ویران کیسے نہ ہو؟ وہ اقبال جس نے غلاموں کو ذوقِ یقین دیا، گداؤں کو رہ ورسم شاہانہ بتائی، جس نے دنیا کو یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتح عالم کا پیغام حکیمانہ دیا، جب وہ نہ رہا تو اس کی جدائی ہمیں برسوں رلائے گی۔ بڑے دلکش انداز میں گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

تجھے ہم عمر بھر روئیں مگر رونے سے کیا حاصل
نہ تجھ کو پاسکیں گے اپنی جاں کھونے سے کیا حاصل
یہ نالے جب بدل سکتے نہیں تقدیر انساں کو
تو ان مجبوریوں پر نوحہ خواں ہونے سے کیا حاصل[۲]

پھر اقبال ہی کے تصور مرد کامل کو اقبال کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں کہ واقعی اقبال جیسا معجز بیاں شاعر صدیوں بعد ہی پیدا ہوتا ہے۔اور دیکھیے کس خوبصورتی سے اقبال کی تراکیب، فرہنگ اور اشعار کو تضمین کرتے ہیں: ؎

یہ ممکن ہے رگِ گلبرگ تر سے ہوشرر پیدا
نہیں ممکن کوئی اقبالؔ سا ہو پھر بشر پیدا
حیات آوارۂ دیر و حرم رہتی ہے برسوں تک
تو بزم عشق سے ہوتا ہے اک صاحب نظر پیدا
کئی پرویز دادِ عیش و عشرت دے کے مرتے ہیں
تو ہوتا ہے کہیں فرہاد ساخونیں جگر پیدا

۱۔ کلیات حفیظ: ص۸۰۰
۲۔ یادِ اقبال: ص۴۰

''ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''[۱]

اقبال نے اپنی وفات سے پہلے مندرجہ ذیل الوداعی شعر پڑھے تھے، جو ان کی ایک رباعی ہے:۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید[۲]

حفیظ ہوشیار پوری نے اس کی ردیف آید کہ ناید کا اردو ترجمہ کرتے ہوئے اردو میں ''آہ اقبال'' کے عنوان سے اقبال کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں:۔

کوئی اقبال کا ثانی جہاں میں
پس از عمر دراز آئے نہ آئے
حقیقت آشنائے عشق و مستی
پھر اے بزمِ مجاز آئے نہ آئے
ہوا خاموش وہ دانائے راز اب
کوئی دانائے راز آئے نہ آئے
فقیری میں بھی شان بادشاہی
پھر ایسا بے نیاز آئے نہ آئے
گیا وہ چارہ سازِ دردِ ملت
پھر ایسا چارہ ساز آئے نہ آئے[۳]

۹۔ مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۰ء۔۱۹۵۶ء):

اقبال کے بہت اچھے دوست، شاعر اور ممتاز سیاستدان تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۸ء میں اقبال کی وفات میں لکھی جانے والی اپنی نظم میں اس نقصانِ عظیم کو ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی نقصان قرار دیا ہے۔ اپنی نظم میں جو ''کریسنٹ'' اقبال

۱۔ یاد اقبال: ص۴۱
۲۔ کلیاتِ اقبال (فارسی): ص۸۹۴
۳۔ نذر اقبال: ص۱۶۷

نمبر ۴۸ میں چھپی وہ اقبال کی یاد اور ان کی عظمت کا اقرار کچھ اس طرح کرتے ہیں: ۔

گھر گھر یہی چرچے ہیں کہ اقبال کا مرنا
اسلام کے سر پر ہے قیامت کا گزرنا
کلکتہ و کابل میں بچھی ہے صفِ ماتم
اس غم میں سیہ پوش ہیں بغداد و سمرنا
ہر روز دیا اس نے مسلماں کو یہی درس
ہرگز نہ کسی سے بجز اللہ کے ڈرنا
ملت کو نئی زندگی اقبال نے بخشی
ممکن نہیں اس بات کا اقرار نہ کرنا[1]

مولانا ظفر علی خان کی یہ نظم ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمان ہے۔جلیل قدوائی کہتے ہیں: ۔

''علامہ کے انتقال پر نہ جانے کتنی نظمیں لکھی گئی شاید شدتِ غم میں شاعر کی زبان گنگ اور قلم کے سوتے خشک ہو جاتے ہیں۔تمام مطبوعہ نظموں میں جن اشعار نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ مولانا ظفر علی خاں کے تھے جن سے بڑھ کر شاید اس سانحے پر اور اشعار لکھے بھی نہیں گئے'' ۔[2]

۱۰۔ عاصی مینائی:

عاصی مینائی کا اصل نام غلام جیلانی تھا۔اردو اور فارسی دونوں پر مہارت رکھتے تھے۔شاعر مشرق سے دلی عقیدت اور لگاؤ تھا۔اقبال کی وفات پر'' مرثیہ علامہ اقبال مرحوم ومغفور'' لکھا جو ۱۹۳۹ء کو کتابی شکل میں شائع بھی ہوا۔ اس کا دیباچہ تلمیذِ اقبال اسدؔ ملتانی نے تحریر کیا۔مرثیے کے بند باری باری فارسی اور اردو ہر دو زبانوں میں تحریر کیے گئے ہیں۔ مرثیے کے دس بند ہیں۔عاصیؔ کہتے ہیں: ۔

اب نہ وہ بزم نہ وہ ساقیٔ رعنائے نشاط
اب نہ وہ جام نہ وہ ساغر وصہبائے نشاط
یک بیک حیف دگرگوں ہوا رنگِ عالم
وہ نشاط اور نہ وہ رونقِ دنیائے نشاط[3]

۱۔ بیادِ شاعرِ مشرق : ص۱۹۸

۲۔ اقبال کے ہم نشیں: ص۹۶

۳۔ عاصی مینائی:مرثیہ حضرت علامہ اقبال (س۔ن،ن۔ن) ص۳

اقبال کی تعریف وتحسین کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ناظم سحرِ بیاں شاعرِ غرا ہیہات
مرگِ ملت ہے تیری رحلتِ حسرت آیات
غیر ممکن ترے اوصاف ومحامد کا شمار
سخت مشکل تیری تشریح کمال درجات[۱]

آخری بند میں اقبال کی وفات کو بہت بڑا نقصان قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

گرچہ محفل ہے وہی رونق محفل نہ رہا
گرچہ منزل ہے وہی واقف منزل نہ رہا
کیوں سیہ پوش نہ ہو انجمن علم وادب
ہائے وہ فلسفی و شاعر کامل نہ رہا
نازش کعبہ دیں دشمن اصنام نماند
حامل طنطنۂ سطوت اسلام نماند[۲]

۱۱۔ عظامی شیخ عزیز الدین (۱۸۹۸ء۔۱۹۵۷ء):

ہوشیار پور کے معروف عالم دین اقبال کے عقیدت مندوں میں شمار ہوتے ہیں چونکہ خود زبردست مبلغ اسلام تھے اور اقبال کی فکر سے ان کے خیالات بھی چلا پلاتے تھے۔اس لیے بھی اقبال کی جدائی کو بہت محسوس کیا۔فارسی زبان میں ''نالۂ عظامی خستہ حال درفراقِ حضرت علامہ سرمحمد اقبال'' کے عنوان سے اقبال کی وفات پر نظم کہی۔فرماتے ہیں کہ اقبال کی وفات کے غم میں زمین وفلک بحرِ خون میں غرق ہیں۔پھولوں نے دیوانگی میں اپنے لباس چاک کر لیے ہیں عنادل اور قمریوں کی آہ وفغاں نشتر کی طرح چبھتی ہے۔وہ اقبال کی زبان اسرار خودی سے ترتھی جو رموز بے خودی کا ترجمان تھا، جو حبِ احمدؐ کے جام سے مست تھا۔جو سوز بلالی سے سرشار تھا، وہ دانائے راز، شاعری کا سکندر، افسوس صد افسوس کہ آج مرگیا۔آگے چل کر فرزندِ اقبال اور علی بخش کی آہ وزاری کا ذکر کرتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ اے عظامی یہ آہ وزاری اور اشکباری کب تک؟ موت سے کسی کو مفر نہیں ہے۔قضا شاہ وگدا میں فرق نہیں کرتی اور نظم کے آخر میں اپنے آپ کو یوں نصیحت کرتے ہیں:۔

عظامیؔ شکوۂ افلاک تا چند
بسرخاک وگریباں چاک تاچند

۱،۲۔ مرثیہ حضرت علامہ اقبال: ص۳،۴، ۱۱،۱۰

فلک را رسم و آئینِ وفا نیست
بچشم این ستم کیشے حیا نیست
دل خود وقف تسلیم و رضا کن
زبان خویش مصروف دعا کن
الٰہی قصرِ جنت جائے اوباد
حریم رحمت ماوائے او باد[1]

۱۲۔ منشی محمد دین فوق (۱۸۷۶ء۔۱۹۴۵ء):

اقبال کے بہت اچھے دوست اور شاعر تھے۔ اقبال نے کشمیر کے حوالے سے ان کی کاوشوں کو بہت سراہا۔ خود بھی اقبال کے مداحوں میں تھے۔ اقبال کی وفات کے روز ۲۱ اپریل کو فوق صاحب شدید بیمار تھے۔ مگر انتہائی تیز بخار کے ساتھ اسلامیہ کالج گراونڈ تک گئے اور تدفین تک حاضر رہے۔ اس کے بعد بھی جب تک زندہ رہے اپنے دوست کا ماتم کرتے رہے اور ان کی یاد کو سینے سے لگائے رہے۔ دیکھیے ایک غزل میں ان کی مفارقت کا ذکر کسی حسرت سے کرتے ہیں:۔

اجل اس مردِ حق آگاہ کو بھی لے گئی یا رب
حقیقت کا جسے بھیجا بنا کر ترجماں تو نے
ہوئے جس سے اسرارِ خودی و بےخودی ظاہر
نہ پلوائی کبھی وہ مے مجھے پیرِ مغاں تو نے[2]

۱۳۔ فیض احمد فیضؔ (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء):

فیض احمد فیضؔ کی نظم ''اقبال'' کا شمار اقبال کی ستائش میں کہی جانے والی نظموں میں بہ اعتبار اسلوب و مضامین سر فہرست میں ہوتا ہے۔ فیضؔ نے اقبالؔ کو ان کی زندگی میں سراہا اور ان کی وفات کے بعد بھی۔ بے پناہ دلکش اسلوب میں لکھی گئی یہ نظم اپنی لغت میں بھی اقبالؔ سے متاثر ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں:۔

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خوان گزر گیا

---

[1] نذر اقبال: ص۱۴۲

[2] معاصرین اقبال کی نظر میں، ص۳۴۵

سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں[۱]

فیض احمد فیض اپنی اس نظم میں اقبال کو خوش نوا فقیر اور شاہِ گدا نما کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں اور اقبال کی بالکل صحیح تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ دھیمے سروں میں کہی گئی فیض کی یہ نظم ہمارے سامنے اقبال کی مکمل تصویر کھینچ دیتی ہے۔

۱۴۔ علامہ کیفی چڑیا کوٹی (۱۸۹۰ء۔۱۹۵۶ء):

اپنے تمام علم و فضل اور شاعرانہ قابلیتوں کے باوصف علامہ اقبال کی پر جوش اور حریت آموز قومی شاعری اور زندگی افروز پیغام کی معجز نمائی کے قائل اور معترف تھے۔ مولانا نے اقبال کی وفات پر ساٹھ اشعار کی غیر فانی نظم کہی۔ اس میں اقبال کی گونا گوں عظمتوں اور رفعتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ''طائر طوبیٰ'' قرار دیا۔ بارہ شعری اقتباسات پر مشتمل اس نظم کے آخر میں اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تو روحِ طائر طوبیٰ تھا پیکر اقبال
نہیں ہے صورتِ انساں میں تیری کوئی مثال
زمیں کو چھوڑ کے آیا ہے آسماں کی طرف
کہ پست ہو کے رہے کیوں ترا بلند خیال
تو آ کے خلد میں اب عیش جاودانی کر
مقامِ جسم تری روح کر چکا ہے نڈھال
چہک تو شاخ پہ طوبیٰ کی دل اگر چاہے
کہ اہلِ خلد کو بھائی ہے تیری طرزِ مقال
ادھر کہ خلد کو رونق بڑھائی جاتی ہے
ادھر ہے خاک کہ کیفی اڑائی جاتی ہے[۲]

اپنی ایک اور نظم بہ عنوان ''ڈاکٹر محمد اقبال'' میں اقبال کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے اقبال ہمیں خلاق

۱۔ فیض احمد فیض: نسخہ ھائے وفا (لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء) ص ۷۷

۲۔ معاصرین اقبال کی نظر میں: ص ۴۶۸

مضامین، لفظوں کا ٹھاٹھ اور معنوی شان یہ سب خوبیاں تیری شاعری سے پتا چلتی ہیں پھر اپنی قسمت پر اس طرح نازاں ہوتے ہیں:۔

سب جسے جانتے تھے گنج نہاں
برسرِ رہ لٹا دیا تو نے
ہے یہ قسمت کہ شاعرِ اقبال
قوم کو اے خدا دیا تو نے[1]

۱۵۔ ناظؔر چودھری خوشی محمد (۱۸۷۲ء۔۱۹۴۴ء):

ناظؔر نے جو اقبال کے ہم عصر شاعر اور دوست تھے۔ اقبال کی جدائی کو بہت شدت سے محسوس کیا اور بڑا دلگداز اور رقت آمیز مرثیہ لکھا۔ بڑے دکھ بھرے اور گلو گیر لہجے میں اقبال کو الوداع کہتے ہیں:۔

الوداع اقبال اے محبوبِ دوراں الوداع
الوداع اے قوم کے نجم درِ خشاں الوداع
الوداع اے سارباں ناقۂ بیت الحرام
اے حجازی کاروانوں کے حدی خواں الوداع
آج نعش اقبال کی مسلم کے زیب دوش ہے
بزمِ ملت کی یہ شمع آخری خاموش ہے[2]

اپنے اس طویل مرثیے میں آگے چل کر اقبال کے غم میں متصل رونے کا عزم کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

ماتمِ اقبال میں ہم اس قدر رویا کریں
سال و ماہ و روز و شب صبح و مسا رویا کریں
اپنے بیگانے کے دل پر ہے تری فرقت کا داغ
آشنا رویا کریں، ناآشنا رویا کریں[3]

۱٦۔ نظیؔر لدھیانوی (اصغر حسین خان) (۱۹۰۲ء۔۱۹۸۹ء):

نظیؔر نے اقبال کو زندگی میں بھی خراج تحسین پیش کیا اور بعد از مرگ بھی۔ اقبال کی وفات نے انھیں سخت

---

[1] بیادِ شاعر مشرق: ص۲۵٦

[2] نذر اقبال: ص۱۳۳

[3] ایضاً ص۳۵۔۱۳۴

صدمے سے دوچار کیا۔ انھوں نے اقبال کی وفات پر حسب ذیل نظم کہی جو روزنامہ ''زمیندار'' میں شائع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اکبرالٰہ آبادی، مولانا گرامی، مولانا محمد علی جوہر جیسی عظیم الشان ہستیاں اس دنیا سے اٹھ گئیں اور آج اقبال کے رخصت ہو جانے سے داستانِ حال تاریخ ماضی بن گئی۔ اس کے بعد چند فارسی اشعار میں اقبال کی شاعری کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور نظم کے آخر میں اردو اشعار میں اقبال کے بعد قحط الرجالی پر نوحہ کناں ہیں:۔

اب حیات وموت کے اسرار بتلائے گا کون
عظمت اسلام کی تاریخ دوہرائے گا کون
کون دوہرائے گا اب افسانہ ضرب کلیم
کون بتلائے گا اب اسرار قرآن حکیم
کس سے اب جا کر سنیں ترک وعرب کی داستاں
کون دکھلائے ہمیں شانِ حجازی کے نشاں
تیرے ماتم میں بسر کر دیں گے ماہ وسال ہم
روئیں گے صبحِ قیامت تک تجھے اقبال ہم[1]

اس نظم کے علاوہ بھی ان کی نظمیں بعنوان ''مدفن اقبال''، ''نقش سویدا'' اور ''تابوت افغانی مزار اقبال پر'' اقبال کی وفات کے بعد ان کی طرف سے اقبال کی عظمت کا بھرپور اعتراف لیے ہوئے ہیں۔

مختصر یہ کہ اقبال کی وفات کے غم کو ان کے ہم عصر شعرا نے بہت شدت سے محسوس کیا اور صرف ان کے ہم عصر ہی نہیں بلکہ بعد میں آنے والے شعرائے کرام بھی اقبال کے فکروفن سے متاثر ہوئے اور انھوں نے بھی اقبال کو منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ اور آج ہمارے سامنے اقبال کی شان میں لکھی جانے والی نظموں کا ایک وقیع سرمایہ موجود ہے۔ ان نظموں کے خالق شعرا میں طلباء بھی ہیں، سائنسدان بھی، ڈاکٹر بھی اور سیاست دان بھی۔ شعرا کی ایک طویل فہرست میں ترقی پسند شعرا بھی ہیں، رومانوی بھی، روایت پسند شاعر بھی اقبال کے آگے سرِ عجز نیاز جھکائے بیٹھے ہیں اور مزاحیہ شاعر بھی ان کی ذات میں اعلیٰ صفات تلاشتے دکھائی دیتے ہیں۔ سر عبدالقادر نے درست کہا تھا:

''کلام اقبال کو جو عالمگیر مقبولیت سر محمد اقبال کی زندگی میں حاصل ہوئی، اس کی مثال ادبیات کی تاریخ میں کمیاب ہے اور جس فراخدلی کے ساتھ ان کے ہم عصر شعرا نے ان کی وفات کے بعد ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے وہ بالکل بے مثل ہے۔ مجھے اور کوئی نظیر معلوم نہیں کہ اتنے شاعروں نے اپنے ہم عصر کے کلام کی داد ایسی بے ساختگی سے دی ہو جیسی اقبال کے عہد کے

---

[1] اقبال کے ہم نشین: ص۵۴

شعرا نے دی ہے ان میں بعض ایسے ہیں جو ابتدا میں اقبال کی بڑھتی ہوئی شہرت پر رشک کرتے تھے مگر آخر مان گئے کہ قسامِ ازل نے جو بلندی سرِ اقبال کو دی تھی وہ ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی‘‘۔[۱]

---

[۱] یاد اقبال: ص۴۔۳

فصل چہارم:

عرب شعرا کا منظوم خراج تحسین

اقبال کو سرزمین حجاز سے ہمیشہ سے گہری عقیدت و محبت رہی ۔رسول اکرمؐ کی محبت،قوم رسول ہاشمی اور دیار عرب ان کے دل و دماغ پر کچھ اس طرح چھائے رہے کہ ان کے شعر و فکر کا جزو لاینفک بن گئے ۔اقبال کی شدید آرزو تھی کہ کسی طرح اتحاد اسلامی کی بنیاد یعنی عالمِ عرب ان کے پیغام سے کما حقہٗ آگاہ ہو سکے۔اقبال کی یہ خواہش ان کی زندگی میں اس طرح پوری نہ ہو سکی جس طرح اقبال چاہتے تھے تاہم مصر کے بابائے اقبالیات عبدالوہاب عزام کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ انھوں نے اپنے تراجم کے ذریعے پہلی بار کلام اقبال سے عربوں کو روشناس کروایا۔وہ نہ صرف اقبال کے اولین مترجم ہیں بلکہ ان عرب ادیبوں میں نمایاں مقام کے حامل شاعر ہیں،جنھیں اقبال کی صحبت کا شرف بھی حاصل ہوا۔ انھوں نے اقبال کی زندگی ہی میں انھیں عرب دنیا سے متعارف کرایا اور ان کے کلام کے ترجمے کو عربی اشعار میں ڈھال کر عرب قارئین کے سامنے پیش کیا۔عبدالوہاب عزام نے اقبال کو ان کی زندگی میں بھی خراج تحسین پیش کیا اور ان کی وفات کے بعد بھی،ڈاکٹر ظہور احمد اظہر لکھتے ہیں:

> ”اقبال کی زندگی ہی میں عزام کو جب سرزمین ہند سے آوازِ حق اور نعمۂ شوق کی گونج پہنچی تو انھوں نے سب سے پہلے اسے سنا،سمجھا اور وجد میں آ کر بول اٹھے
>
> صَـوْتَ اِقْبَـــالِ عَـلَـى شَـطِّ الْـمِـزَارِ
> أَشَـمـعُ اليـقـظـانَ فى هَـذِى الَّـديـارِ
> وَمَـنُ الْبِـــاَعِــثُ فِــى مَيِّــتَ الْاُمَـمِ
> ثَـورَـةَ الـعَـزَـةِ مَــن هَــذ الهِــمَـم
> لَاحَ لا نُـغِـرـةِ فِــى هَـــذَاَ السَّـــوَدِ
> بَـصَّ كَـالُـجَـمرَـةِ فِـى هَـذَا لَّـرمَـادِ[1]

ترجمہ:-

اس دوری اور فاصلے کے باوجود اس دیارِ عرب میں میں عالمِ بیداری میں

---

[1] ظہور احمد اظہر،ڈاکٹر: مضمون ”اقبال کا پہلا عرب مترجم ڈاکٹر عبدالوہاب عزام“مشمولہ اقبال ممدوح عالم ،مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر (لاہور بزم اقبال۔۱۹۷۸ء) ص ۳۴۸

اقبال کی آواز سن رہا ہوں۔ مردوں میں قوتِ عزم پیدا کرنے والا اور عزم وہمت کا انقلاب کرامت برپا کرنے والا یہ کون شخص ہے؟ جو اس تاریکی میں ہلال بن کر چمکا اور جو اس راکھ میں چنگاری بن کر روشن ہوا۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں جب اقبال نے سفرِ آخرت اختیار کیا تو یہ غمناک خبر دنیائے عرب میں بھی بڑے رنج والم کے ساتھ سنی گئی۔ بیت المقدس میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں تقریر کے لیے عبدالوہاب عزام کو خصوصی طور پر بلوایا گیا۔ اقبال کے اس عاشق اور شیدائی نے علامہ کو ان کی وفات کے بعد بھی خراجِ تحسین پیش کیا۔ ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان سے چار ماہ قبل عزام ہندوستان آئے اور مزار اقبال پر حاضری دینے کے لیے دہلی سے لاہور کا سفر اختیار کیا۔ اسی موقع پر چار شعر نظم کیے اور سنگِ مرمر کی لوح پر کندہ کرا کے لاہور لائے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ لوح مزارِ اقبال کی عمارت میں جگہ پائے۔ اشعار حسبِ ذیل ہیں:۔

عَرَبِی یُهْدِی لِرَوْضِکَ زَهْراً ذَا افْتِخَارٍ بِرَوْضِهِ وَاعْتِزَازِ

کَلِمَاتٍ تَضَمَّنَتْ کُلَّ مَعْنًی مِنْ دِیَارِ الاِسْلَامِ فِی اِیجَازِ

بِلِسَانِ الْقُرْآنِ خُطَّتْ فَفِیْهَا نَفَحَاتُ التَّنْزِیْلِ وَالْاِعْجَازِ

فَاقْبَلْهَا عَلَی ضَآلَةِ قَدْرِی

فَهِیَ فِی الْحَقِّ اَرْمَغَانُ الْحِجَازِ

ترجمہ:۔

ایک عرب تیرے باغ کے لیے کچھ پھول لایا ہے
جنھیں اپنے باغ پر بڑا فخر وناز ہے
(یعنی) چند الفاظ جو دیار اسلام کے تمام مفاہیم
اختصار کے ساتھ دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں
یہ قرآن کی زبان میں لکھے گئے ہیں
لہٰذا ان میں خوشبوئے تنزیل واعجاز کی لپٹیں موجود ہیں
کہ یہ سچ مچ ارمغانِ حجاز ہیں[1]

دنیائے عرب میں تعارفِ اقبال کے سلسلے کی ایک اور فعال شخصیت پروفیسر محمد حسن الاعظمی کی ہے۔ ہندوستان میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے الازہر گئے اور پھر وہیں کے وہیں ہو رہے۔ پروفیسر حسن الاعظمی نے مصر میں ۱۹۳۸ء میں اتحاد العالم الاسلامی کے نام سے تنظیم قائم کی۔ اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے پیغام اقبال کو عرب دنیا میں

[1] خورشید رضوی، ڈاکٹر: تالیف (لاہور، شہ تاج مطبوعات، ۱۹۹۵) ص ۱۱۹

پھیلانے کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی گئیں۔اعظمی صاحب کلام اقبال کا عربی نثر میں ترجمہ کرتے اور جامعہ الازہر کے ممتاز نابینا عالم اور قادر الکلام شاعر استاد الصاوی علی شعلان کو سناتے تھے اور صاوی علی شعلان ان کو منظوم ترجمہ کی شکل دیتے۔صاوی شعلان کے مقبول تراجم میں ''شکوہ و جواب شکوہ'' کا ترجمہ حدیث ''الروح اقبال'' اور ''ترانہ ملی'' کا ترجمہ ''النشید الاسلامی'' ہے۔صاوی شعلان اقبال کے زبردست مدّاح تھے۔انھوں نے اقبال کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔کہتے ہیں:۔

من لی باقبال والایات یر سلها
وللشقائق فی ان مها شیے
قد شاد فی شعره ابیات امة
واشعب قبل القوافی حسن تنظیم
کانه حسین یملی شعره کتبا
یزجی اکتائب جیشا والسطوردم[1]

ترجمہ:۔

اقبال جیسا معجز بیان شاعر آج کہاں ملے گا جس کے لالۂ طور سے مشامِ جاں معطر ہے۔اس نے اپنے کلام سے پاکستانی قوم کی عظمت کی تعمیر کی۔ ان کی شاعری وزن وقافیہ سے زیادہ نظم وضبط اور تعمیرِ فکر کی آئینہ دار ہے۔ان کا کلام ایک لشکرِ جرار کی طرح ہے جس کی ہر سطر خونِ دل سے لکھی گئی ہے۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اقبال کے افکار کو عرب دنیا میں عام کرنے میں مصر کے علماء اور شعرا نے زبردست کردار ادا کیا ہے۔اس فن میں جہاں ہمارے سامنے عبدالوہاب عزام، حسن الاعظمی، اور صاوی شعلان جیسے نامور نام آتے ہیں، وہیں فلسفۂ اقبال کو تراجم کی شکل میں پیش کرنے والے دیگر شعرا میں محمد علی علوبہ پاشا، السید عبدالمجید خطیب، عبدالباری انجم، عمر بہاء الامیری، اور امین زبیری وغیرہ کے نامِ نامی بھی ملتے ہیں اور آج شعرا اقبال کا تقریباً تمام تر ذخیرہ عربی میں منتقل ہو چکا ہے اور اس عظیم کارنامے کا کریڈٹ مصر کے شعرا اور ادباء کو جاتا ہے۔

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر نے اپنی کتاب ''اقبال عرب شعرا کی نظر میں'' میں مصری شعرا کے اقبال کی شان میں کہے گئے قصائد کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس ضمن میں سترہ (۱۷) قصائد مع تراجم کے پیش کیے ہیں۔ اقبال کے ان مداح قصیدہ نگاروں کے نام اور ان کے قصائد کے عنوانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ احتفال الشعر بیوم اقبال	الاستاذ محمود حسن اسماعیل
۲۔ الباکستان	الاستاذ الشیخ الصاوی علی شعلان

---

[1] اقبال ممدوحِ عالم: ص ۳۳۷

۳۔ اقبال قیثارۃ السماء — الاستاذ الشاعر عبداللہ شمس الدین

۴۔ إلی شاعر الھند الکبیر من شاعر الاحرام — محمد عبدالغنی حسن

۵۔ إلی شاعر مسلمی الہند الدکتور محمد اقبال — لاستاذ الشاعر عبدالرحمٰن بزمی

۶۔ فلسفۃ الحیاۃ للشاعر الفیلیوف محمد اقبال — الأ ستاذ الشیخ الصاوی علی شعلان

۷۔ اقبال — للأ ستاذ الشاعر عزیز اباظہ پاشا

۸۔ ذکر محمد اقبال — محمد عبدالمنعم ضیف اللہ

۹۔ اقبال — خالد الجرنوسی

۱۰۔ اقبال والاسلام — محمد مصطفیٰ حمام

۱۱۔ پاکستان — للشاعر الأ دیب الاستاذ محمود جبر

۱۲۔ اقبال أمیر الکلمۃ — للدکتور سعد ظلام

۱۳۔ مصر والباکستان — الاستاذ الادکتور ابراہیم ناجی

۱۴۔ عید الباکستان — الشیخ الصاوی علی شعلان

۱۵۔ الی اقبال — للدکتور حسین الجیب المصر ی

۱۶۔ فی ذکری اقبال — للدکتور حسین الجیب المصر ی

۱۷۔ ذکرک اقبال — عبدالرزاق محی الدین

مذکورہ بالا قصائد کو موضوعاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ قصائد اقبال کے اعجاز و کمالِ فن کے بھر پور اعتراف کے ساتھ ساتھ ان عرب شعرا کی اقبال کے ساتھ بے پایاں محبت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان قصائد میں فلسفۂ اقبال کی تشریحات بھی ہیں، اقبال کے خواب پاکستان، اوراس کے عوام کے ساتھ محبت کا شدید اظہار بھی ہے اور اقبال کی فکر و فن پر مہارت تامہ کا اعتراف بھی ہے۔ عزیز اباظہ پاشا اپنے قصیدے ''اقبال'' میں فلسفۂ اقبال کی تشریح و توضیح کے بعد علامہ سے اپنی محبتِ فراواں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں: ؎

انت حی اقبال فی جنۃ القلب

وفی لحن بنفسہ وبکائہٖ

فی التواء الایام فی لذۃ

الالام فی شقوۃ الھوی وغَنائہٖ

فی عبیر الارواحِ فی ألقِ ألاءَ

صباح فی الساکبات من أندائہٖ

انتــاحيّــی اقبــال تــحـت غـطــاء الـمــو
تِ واعــلــی الــحيــاة تــحـت وِ طــائــه[1]

ترجمہ:-

اقبال آپ تو میرے دل کی جنت میں زندہ ہیں۔ میرے دل کی دھڑکن اور
آہ ودرد کی آواز بھی شامل ہیں۔
عسرت ایاّم ،لذتِ آلام اور دردِ محبت وآزمائشِ عشق میں بھی آپ ہی کی
یادزندہ ہے۔
ہواؤں کی عطر بیزی،صبح کی روشنی اور تحلیل ہونے والی شبنم میں بھی آپ کی
یادزندہ ہے۔
اقبال آپ تو موت کے دبیر پردوں کے باجود بھی زندہ ہیں اور بلند تر زندگی
تو ہوتی بھی وہی ہے جو موت کے پردوں کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

ان قصائد کے موضوعات میں اقبال کی امتِ مسلمہ سے محبت اور اپنی مسلم امت کے زخم خوردہ ہونے اور ان کے مصائب پر تڑپنے اور علاج ڈھونڈنے کی بے چینی کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جابجا اس حسرت وآرزو کا اظہار ملتا ہے کہ کاش اقبال جیسے شاعر امتِ مسلمہ کے ہرگروہ میں پیدا ہوتے، جو غافلوں کو جھنجھوڑتے اور سوتوں کو جگاتے۔ ان کے نزدیک اقبال کی شاعری ایک پیغام ہے، ایک دعوتِ عمل ہے اور نغمۂ توحید کے ساتھ ساتھ رسالتِ سماوی کی بھی ترجمان ہے۔ ان کی رائے میں اقبال کی شاعری نہ صرف یہ کہ اسلام کی عظمت رفتہ کے دل آویز، جگر سوز، اور روح پرور نغمات ہیں بلکہ بھٹکی ہوئی ملتِ اسلامیہ کے لیے نشانِ منزل کا ترانہ اور دکھی انسانیت کے دردوغم کا مداوا بھی پیش کرتی ہے۔

---

[1] اقبال عرب شعرا کی نظر میں: ص ۱۰۲

فصل پنجم:

ایرانی شعرا کا اقبال کو منظوم خراجِ تحسین

ایران سے اقبال کو خاص لگاؤ تھا۔ یہ اس حکیم پاک زاد مرشد رومی کا وطن تھا، جس نے اقبال پر مرگ و زندگی کے راز منکشف کیے تھے اور جس کی روحانی شخصیت کے سامنے وہ اپنے آپ کو مریدِ ہندی سے زیادہ نہیں سمجھتے تھے اور پھر ان کا آبائی وطن کشمیر بھی ایران صغیر کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اقبال کی عمر کا ایک حصہ ایرانی ادبیات کے سدا بہار باغ کی سیر میں صرف ہوا اور اس سے انھوں نے وہ پھول چنے جن کی خوشبو سے ان کا سارا کلام معطر ہے ایران اور ملتِ ایران سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ ''زبور عجم'' میں علامہ نے ایک غزل میں ایران کی نوجوان نسل سے جس محبت کا اظہار کیا ہے وہ اس کے ایک ایک شعر سے عیاں ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

چون چراغِ لاله سوزم درخیابانِ شما
ای جوانان عجم جانِ من و جانِ شما
غوطه ہازد در ضمیر زندگی اندیشه ام
تابدست آورده ام افکار پنہانِ شما[1]

جب ہم ایران میں اقبال شناسی کی روایت کا تاریخی تسلسل میں مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارا اس اولین شخصیت سے تعارف ہوتا ہے جس نے اقبال کو پہلے پہل ایران میں متعارف کرایا۔ یہ ایک ایرانی استاد سید محمد داعی الاسلام تھے، جو جامعہ عثمانیہ دکن میں شعبۂ فارسی کے بانی اور صدر تھے۔ انھوں نے ایرانی اہلِ علم پر لیکچرز کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ اس ضمن میں انھوں نے اقبال کی فارسی شاعری پر بھی لیکچر دیا جسے بعد میں ''اقبال و شعر فارسی'' کے نام سے ایک پمفلٹ کی صورت میں طبع بھی کروا دیا گیا۔ یہ پمفلٹ ۱۹۲۸ء میں طبع ہوا۔ بعد ازاں اس پمفلٹ کا اردو ترجمہ ''نقوش''، لاہور اقبال نمبر ۱۹۷۷ء شمارہ ۲ میں شائع ہوا۔

۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک یعنی اقبال کی وفات تک ایران میں اقبالیات کے میدان میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ اقبال کی وفات کے کافی عرصہ بعد تہران کے ادبی مجلّہ ''ارمغان'' میں پہلی بار اقبال کی سوانح عمری شائع ہوئی۔ اقبال کو سب سے پہلے جس ایرانی شاعر نے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا وہ اقبال کے شیدائی ملک الشعرا بہار تھے۔

۱۹۴۵ء میں اردو زبان میں کے مشہور شاعر ن۔ م راشد کی تحریک پر اقبال کے ایرانی عقیدت مندوں نے تہران کے موزہ ایران باستان (ایران قدیم کے عجائب گھر) کے وسیع ہال میں ایک ادبی اجلاس کا اہتمام کیا اس اجلاس میں

---

[1] کلیات اقبال فارسی: ص ۵۱۷

ملک الشعرا بہار نے ایک نظم کے دوران غیر منقسم ہندوستان کو مخاطب کیا۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا کا ذکر کرنے کے بعد جب اقبال کے ذکر پر پہنچے تو انھوں نے کلامِ اقبال کے حسن و زبان، گیرائی و گہرائی سے متاثر ہو کر ان الفاظ میں ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا:

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت

واحدی کز صد ہزاراں بر گذشت

شاعران گشتند جیشے تار و مار

ویں مبارز کرد کار صد سوار[1]

ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی کافی عرصہ ایران میں قیام پذیر رہے اور اپنے قیام کے دوران انھوں نے اقبال کو ایران میں متعارف کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ گاہے بگاہے ایران کے شعرا تک کلام اقبال کی حکمت و دانائی پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اپنی کتاب "اقبال ایران" میں انھوں نے دانش گاہِ تہران میں بہار کی آمد اور ان کے خیر مقدم کا ذکر کیا ہے کہتے ہیں کہ بہار کی آمد پر میں نے ان کی مشہور نظم پڑھی:

عصر حاضر خاصہ اقبال گشت

اس کے بعد ملک الشعراء نے خود اپنے اشعار کی توضیح فرمائی:

"اقبال کے کلام میں ظاہری اور معنوی لحاظ سے ہمارے ہر قسم کے فارسی شعرا کی خوبیاں پائی جاتی ہیں، زبان و بیان میں اس نے مکتبِ تصوف و عرفان کے شعرا صائبؔ و کلیمؔ اور غنیؔ کاشمیری کے منظوم آثار سے بھی استفادہ کیا ہے اور اکثر عالی قدر شعرا کی تجلیل اور جا بجا ان کے اشعار پر تضمین کی ہے اور مکتبِ عرفان کے شعرا میں سے مولانا رومیؔ کو اپنے رہنما تسلیم کیا ہے"[2]

اور یوں ملک الشعرا بہارؔ کے اس خراجِ تحسین کے زیرِ اثر ادبیات ایران میں اقبال شناسی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ بہار، ایران کے عصر حاضر کے بہت بڑے شاعر، عالم اور محقق تھے۔ انھیں اقبال سے والہانہ عشق تھا۔ چنانچہ انھوں نے کئی ایک منظوعات میں اقبال کا ذکر کیا ہے۔ صادقؔ سرمد ایران کے شاعرِ ملی اور ملک الشعرائی کے منصب پر فائز تھے۔ آپ بھی اقبال کے شیدائیوں میں سے تھے۔ ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی لکھتے ہیں:

"ہندو پاکستان میں غالباً کسی شاعر نے اقبال کی تجلیل میں اتنے زیادہ اور اس قدر بلیغ اشعار نہیں لکھے جتنے صادقؔ سرمد نے"[3]

---

[1] سلیم اختر، ڈاکٹر (مرتب): ایران میں اقبال شناسی کی روایت (لاہور سنگِ میل طبع اول ۱۹۸۳ء) ص ۱۰

[2] عبدالحمید عرفانی، خواجہ، ڈاکٹر: اقبال ایران (سیالکوٹ، بزم رومی، ۱۹۸۶ء) ص ۷۹

[3] عبدالحمید عرفانی، خواجہ، ڈاکٹر: اقبال ایرانیوں کی نظر میں (کراچی، اقبال اکادمی، بار اول ۱۹۵۷ء) ص ۲۵۶

مارچ ۱۹۵۰ء میں شہنشاہِ ایران پہلی مرتبہ پاکستان تشریف لائے تو سرمدؔ بھی ہمراہ تھے۔ انھوں نے حکیم الامت سے اپنی عقیدت ومحبت کے اظہار کے لیے فی البدیہہ اشعار کہے۔ ان کے مشہور قصیدہ بعنوان ''نغمہ اقبال'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ای مسلمانانِ پنجابی زهی اقبالتان
کز دم اقبالتان مقبول شد آمالتان
نغمهٔ اقبالتان سوی قطار آورد باز
ای مسلمانان پنجابی زهے اقبالتان[1]

اپریل ۱۹۵۰ء میں ایران میں پہلی بار یوم اقبال منایا گیا۔ اس موقع پر سرمدؔ نے تیس ۳۰ سے زائد اشعار پر مشتمل جو طویل قصیدہ پڑھا وہ ان کی قدرت بیان اور روشن طرزِ فکر کا عمدہ نمونہ ہے۔ کہتے ہیں:۔

اگرچه مرد بمیرد بگردش مه و سال
نمرده است و نمیرد محمد اقبال
حیاتِ صورتش ارطی شده است طی نشود
حیات سیرتش ارطی شود ہزار ان سال
درود باد به لاهور و خطه پنجاب
که زاد و پرورد این شاعر خجسته خصال[2]

جب ایران میں دوسری مرتبہ ''یوم اقبال'' منایا گیا تو اس موقع پر صادقؔ سرمد نے ''ایام بزرگ'' کے نام سے درج ذیل قصیدہ پڑھا۔ جس میں بلاغت وروانی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اس میں تاریخ کے بعد عظمت سے بحث کی ہے کہ عظمت مال ودولت ہی کی اکثریت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عظیم افکار وپیغام انسان کو عظمت بخشتے ہیں۔ اقبال عظیم ہے لیکن اس کی عظمت یک روزہ نہیں اس لیے کہ عظیم ہستیوں کے تمام دن عظیم ہوتے ہیں:۔

اقبال بزرگ است که در عالم توحید
از بت شکنی دشمن اصنام بزرگ است
اقبال بزرگ است که برگردنِ اسلام
از خدمت بی منت وی دام بزرگ است[3]

ایران کے ایک اور ممتاز شاعر کاظم رجوی کے مطابق اقبال کے تمام افکار ورجحانات وغیرہ میں مولانا رومؔ،

[1,2] ایران میں اقبال شناسی کی روایت :ص ۲۷
[3] ایضاً ص ۳۱

سعدیؔ اور حافظؔ نے تجلی کی ہے۔ان کے ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

آفرین بر ملک پاکستان و بر اقبال او
آہنین بنیان گزار کاخ استقلال او
شاعری کز گفتہ اش بر ملت خود جاں دمید
برد براوج ثریا پایۂ اقبالِ او[1]

آگے چل کر کہتے ہیں کہ اقبالؔ میں روحِ ایرانی اور اس کے اشعار میں زبانِ پارسی کا حسن جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس کے افکار میں مولوی رومیؔ کا فکر اور سعدیؔ و حافظؔ کی شیریں کلامی اور سحر انگیزی جھلکتی ہے۔

کاظمؔ رجوی نے تمام احساسات کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے:

روح او ایرانی است و گفتہ ہایش پارسی
فیضہا دریا فتہ از چشمۂ سیالِ او
والہ ی شیوای و حسن زبان پارسی
فتنۂ این شاہد شعراست و خط و خال او
مولویؔ و سعدیؔ و حافظؔ تجلی کردہ اند
درھمہ افکار و درآمال و در امیال اُو[2]

حبیبؔ یغمائی ایران معاصر کے استاد شعرا میں سے ہیں اور احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔اقبال کے زبردست پرستار ہیں۔اپنے ایک قصیدے میں اقبال کی بارگاہ میں یوں اپنی عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کرتے ہیں:

زندہ ماند سخنوری کہ ورا
دقتِ فکر ہست ولطفِ خیال
شاعرا نند چون پیمبران
دربیان و فضایل و اقوال
از کلامِ محمدؐ است اثر
درکلامِ محمد اقبالؒ[3]

مشہد سے تعلق رکھنے والے دکتر قاسمؔ رسا بھی اقبال کے شیدائیوں میں سے ہیں۔انھوں نے اقبال پر اپنے

---

[1] اقبال ایرانیوں کی نظر میں: ص۲۸۲
[2] ایران میں اقبال شناسی کی روایت: ص۷۳
[3] اقبال ایرانیوں کی نظر میں: ص۳۱۲

قصیدے میں لکھا ہے کہ لاہور سے ایک ایسے درخشاں ستارے نے طلوع کیا ہے جس پر پاکستان کو ناز ہے۔ اس نے نہ صرف پاکستان بلکہ ہندوستان کو بھی آبروبخشی اور وہ ایسا شاعر شیریں کلام اور روشن دل عارف ہے کہ اس کے سخن پر آفرین کہنے کو جی چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

شاعرے شیریں کلام ونکتہ سنج
عارفی روشن دل و پاکیزہ خو
آفرین برآن سخن واں کزسخن
در جہان بگذاشت آثار نکو
سالک راہِ حقیقت بُود، گشت
از پی عطار و رومی گو بہ کو
درسخن از شاعرِ مغرب زمیں
شاعر مشرق زمیں بر بود گو[1]

ان شعرائے کرام کے علاوہ بھی اقبال پر بہت سے شاعروں نے قصیدے اور نظمیں کہیں اور اقبال کی شعری برتری اور عظمت کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان شعرا میں علامہ دہخدا مرحوم، ادیب برومند، آقای عباس فرات، آقای علی خدائی، دکتر رجائی اور منوچہر طالقانی جیسے بڑے شعرا کے نام آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اقبال ایرانی شعرا اور ایرانی قوم میں بہت مقبول ہیں اور روز بہ روز ان کی مقبولیت اور محبوبیت بڑھ رہی ہے۔ اس وقت تک ان پر بے شمار منظومات وقصائد کہے جا چکے ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت شاید ہی وہاں کوئی نامور ادیب، شاعر اور سیاستدان ہوگا جس نے علامہ اقبال کو خراجِ تحسین پیش نہ کیا ہو۔

---

[1] ایران میں اقبال شناسی کی روایت : ص ۴۵۔۴۴

فصل ششم:

منظوم خراجِ تحسین کا منفرد انداز۔تقلیدِ اقبال

اس فصل میں ہم اقبال کو منظوم خراجِ تحسین پیش کرنے کے ایک جداگانہ انداز کا جائزہ لیں گے۔کسی شاعر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے دو انداز ہو سکتے ہیں۔ایک تو یہی کہ اس کی شان میں اور اس کے اعترافِ عظمت میں کوئی نظم، غزل،قصیدہ،مرثیہ وغیرہ کہا جائے۔دوسرا انداز یہ بھی ہے کہ شعرا اپنے سے برتر شاعر کی پیروی کریں۔یہ پیروی اسلوب اور فکر دونوں میں کی جاتی ہے اور اقبال ان عظیم اور خوش قسمت شعرا میں سے ہیں جنھیں ان کے عہد اور مابعد ایک عالم نے سراہا اور صرف تحسین ہی تک اس سلسلہ کو محدود نہیں رکھا بلکہ عملاً اقبال کے رنگِ شعری کی تقلید کر کے اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

اقبال ایک ایسے چھتنار درخت کی مانند تھے۔جن کے سایے میں بیٹھنے والے شاعر بھی اعلیٰ حیثیت اور مرتبے کے تھے۔اقبال کے عہد میں شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جس نے اپنی شاعری کی تعمیر و تہذیب میں بقدرِ ظرف ان سے کچھ نہ لیا ہو۔خود اقبال بھی اس اندازِ خراجِ تحسین کے قائل تھے اور اقبال کی شاعری بھی اس کی دلیل ہے۔اقبال اپنے ایک مکتوب بنام اکبرالٰہ آبادی میں کہتے ہیں:

> ”عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں ان کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کو داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے یا بالفاظِ دیگر اس کا تتبع کر کے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے“[1]

یہی وجہ ہے کہ اقبال کی عظمت کا اعتراف نہ صرف ان کے ہم عصر شعرا نے کیا بلکہ غیر ہم عصر شعرا بھی اس رنگِ شعری سے نہ صرف مستفید ہوئے بلکہ عملاً ان کی شاعری پر اقبال کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔اقبال کے ہم عصر شعرا تو بالخصوص اقبال سے اس قدر متاثر تھے کہ اگر ایک شاعر اقبال کی فکر سے خوشہ چینی کرتا دکھائی دیتا ہے تو دوسرا ان کی فنی خوبیوں کو دامن میں سمیٹتا ہوا نظر آتا ہے۔بلکہ بہت سے تو ایسے ہیں جو فکر و فن دونوں میں اقبال کی تقلید کرتے ہیں۔دراصل اقبال کی شاعری ان کی زندگی ہی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئی تھی اور اردو شعرا نے فکر و فن کے ان چراغوں سے اپنے چراغ روشن کرنا شروع کر دیے تھے۔

رشید احمد صدیقی کلامِ اقبال کی ہمہ گیری کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ”اقبال کے کلام کی مثال اس متاعِ یوسفی کی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے مصر کے اہلِ ثروت و اقتدار ہی نہیں بلکہ ایک بڑھیا بھی تھوڑی سے روئی لے کر بازارِ مصر میں آ موجود ہوئی تھی“۔[2]

---

[1] مظفر حسین برنی (مرتب): مکاتیب اقبال (دہلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۹ء) ص ۲۹۷

[2] رشید احمد صدیقی: اقبال شخصیت اور شاعری (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء) ص ۸۸

گویا اقبال کی شاعری میں مقناطیسی قوت موجود تھی جس کی بنا پر دیگر شعراان کی طرف کھنچے چلے آئے۔ اقبال کی شہرت وعظمت سے متاثر ہو کر ان کے ہم عصر شعرا میں سے بہت سے شعرا نے اقبال کے فکر وفن کے چمن سے گل چنے ہیں۔ اقبال سے متاثر ان کے ہم عصر اور غیر ہم عصر شعرا میں جنھوں نے اقبال کے رنگ کو اپنایا بہت سے نام ہمارے سامنے آتے ہیں۔ تاہم ان میں سے چند نمایاں شعرا کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا ظفر علی خان (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۵۶ء):

قومی، ملی اور سیاسی شاعری میں اقبال سے بے پناہ متاثر نظر آتے ہیں۔ انھوں نے اقبال کی شان میں بہت سے شعر بھی کہے۔ اور اسلوب میں بھی اقبال کی پیروی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں بہت سے موضوعات اقبال کی شاعری میں مماثل ہیں اور بعض اوقات انھیں پڑھ کر اقبال کی شاعری ہی کا گمان گزرتا ہے:

تو نے اے مسلم کچھ اپنی قدر پہچانی بھی ہے
تو ہے انساں تجھ میں لیکن شان یزدانی بھی ہے
ڈال رکھی ہے گلیمِ فقر اس نے دوش پر
اس کے سر پر ساتھ ہی تاجِ جہاں بانی بھی ہے[1]

غلام بھیک نیرنگ (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۵۲ء):

نیرنگ کا شمار بھی ایسے شعرا میں ہوتا ہے جو اقبال کی طرح قومی و ملی خدمات میں عملی طور پر سرگرم تھے اور جنھیں اقبال کی قربت بھی میسر رہی۔ نیرنگ اپنی نظموں میں ملتِ اسلامیہ کے زوال پر ماتم کے ساتھ ساتھ اقبال کے رنگ میں مسلمانوں کو بیداری، حریت پسندی اور اصلاح کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام دیتے ہیں:

تو اگر مسلم ہے تو اسلام تیری روح ہے
بڑھتے رہنا روح کا ہے تیرا سامان بقا[2]

آغا حشر کاشمیری (۱۸۷۹ء۔ ۱۹۳۵ء):

حشر نے اگرچہ ڈراما نگاری میں شہرت حاصل کی تاہم بنیادی طور پر وہ ایک شاعر تھے اور اقبال سے متاثر بھی اس ضمن میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی رقم طراز ہیں:

"آغا حشر اقبال کے مداحوں میں سے تھے اور اس بنیادی جذبے سے آشنا تھے جس سے اقبال اور ان کا فلسفہ عبارت تھا"۔[3]

---

[1] ظفر علی خان، مولانا: بہارستان (لاہور، یونائیٹڈ، پبلیشر، ۱۹۴۴ء) ص ۱۷۸
[2] معین الدین عقیل، ڈاکٹر (مرتب): کلام نیرنگ (کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۳ء) ص ۱۶۷
[3] گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: لاھور میں اردو شاعری کی روایت (لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء) ص ۱۴۳

اقبال نے خدا سے مسلمانوں کی بدحالی کا شکوہ کیا تھا۔ آغا حشر کے ہاں بھی اقبال کی نظم ''شکوہ'' کا سا خطابیہ انداز، بلند آہنگی اور جوش بیان کا رنگ ملتا ہے۔ ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں[1]

امین حزیں سیالکوٹی (۱۸۸۴ء۔۱۹۶۸ء):

(پ ۱۸۸۴) ایسے شاعر جنھوں نے اردو شاعری میں مکمل طور پر اقبال کا اتباع کیا ہے۔ انھوں نے اقبال کی شاعری کے نمایاں فکری اجزاء زندگی کی تفسیر، تجسس، عظمتِ انسان، قوتِ عمل، یقینِ محکم، خودی اور فرد و جماعت کو اپنی فکر کا مرکز بنایا ہے۔ اقبال کی طرح امین حزیں خودی کی طاقت کو ہر جگہ محسوس کرتے ہیں:

دریا کے تموج میں دریا کی خودی پنہاں
گوہر کے تجمّل میں قطرے کی خودی پنہاں
ہر چیز خودی سے ہے ارضی کہ سماوی ہو
مہر و مہ و انجم میں ہے ان کی خودی پنہاں[2]

جوشؔ ملیح آبادی (۱۸۹۴ء۔۱۹۸۱ء):

جوشؔ کے کلام کا جوش و خروش اور گھن گرج ہمیں اقبال کی یاد دلاتا ہے۔ باوجود اس کے کہ ان کے کلام میں وہ داخلی توانائی موجود نہیں جو اقبال کے ہاں پائی جاتی ہے۔ جوش کے ہاں مغربی تہذیب کے خلاف احتجاج قومی و وطنی شاعری، عشق و عقل اور حیات و ممات وغیرہ کے موضوعات میں اقبال کا رنگ جھلکتا ہے۔ زندگی کی ابدیت کے حوالے سے ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کہتے ہیں فانی جنھیں ہم وہ فنا ہوتے نہیں
مرنے والے اصل میں ہم سے جدا ہوتے نہیں
قیدِ ہستی سے کوئی ذرّہ رہا ہوتا نہیں
ٹوٹ جاتا ہے قفس، طایر رہا ہوتا نہیں
عشق کی شاخیں کسی آندھی سے جھک سکتی نہیں
روح کی سرگوشیاں مرنے سے رک سکتی نہیں[3]

---

[1] بدرامروہی (مرتب): تجلیات حشر (لاہور، تاج کمپنی۔ س۔ن) ص ۲۹۸
[2] امین حزیں سیالکوٹی: گلبانگ حیات (لاہور، سعد بکڈپو، س۔ن) ص ۴۳
[3] جوش ملیح آبادی: سیف و سبو (لاہور، مکتبہ اردو، س۔ن) ص ۱۲۰

راجا عبداللہ نیاز (۱۸۹۵ء۔۱۹۷۱ء):

راجا عبداللہ نیاز بھی اقبال کے نیاز مندوں میں سے تھے۔انھوں نے اقبال کے فکر وفن سے بہت استفادہ کیا ہے۔اس بارے میں پروفیسر جعفر بلوچ لکھتے ہیں:

''علامہ اقبال کے بھی نیاز صاحب بڑے معتقد تھے۔علامہ اقبال سے انھوں نے اپنی تصانیف میں جا بجا استناد واستشہاد کیا ہے''[۱]

نیاز صاحب کے اسلوب اظہار اور طریقِ فکر پر اقبال کا اثر واضح طور پر نمایاں ہے۔بیشتر مقامات پر ان کے اشعار کا لب ولہجہ اقبال کے لب ولہجہ سے ملتا ہے۔ذیل کے اشعار دیکھیے:

ہر وہ نوا بلند ہوئی تھی حجاز سے
جو آج اٹھ رہی ہے تمدن کے ساز سے
ہر گوشۂ بساطِ زمیں جگمگا اٹھا
اسلام کی تجلّی گیتی نواز سے[۲]

حفیظ جالندھری (۱۹۰۰ء۔۱۹۸۲ء):

حفیظ نے اپنی نظم ''تین نغمے'' میں اپنی شاعری کو ٹیگور اور اقبال کے پہلو بہ پہلو لکھ کر دونوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔اس نظم کی ابتدا میں حفیظ خود کو تصادم اور کشمکش کی حالت میں محسوس کرتے ہیں۔آغاز میں ٹیگور کا نغمہ خواب آور اور نرم رو شاعری حفیظ کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔لیکن بالآخر وہ ٹیگور کے نغموں کو اقبال کی شاعری کے مقابلے میں پھیکا اور بے لطف محسوس کرتے ہیں اور اقبال کی اطاعت کا اعلان کرتے ہیں:

اب یہ طوفانِ حیات افزا تھا میرے سامنے
نغمۂ اقبال کا دریا تھا میرے سامنے
میرا نغمہ، نغمۂ دریا سے کم آواز تھا
ہاں مگر ہم رنگ و ہم آہنگ و ہم آواز تھا[۳]

حفیظ کی شاعری میں اقبال کی طرح مسلمانوں کے اندر نئی قومی روح پھونک کر انھیں زندگی کے مختلف سیاسی و معاشرتی پہلوؤں میں ترقی کی طرف گامزن کرنے کی خواہش موجود ہے۔شاہنامہ اسلام کے سبب تالیف میں انھوں نے

۱۔ جعفر بلوچ (مرتب): ارمغانِ نیاز (لیہ، دارالکتاب، ۱۹۸۸ء) ص۳۳

۲۔ ایضاً ص۱۷۲

۳۔ کلیات حفیظ: ص۳۵۴

ایسی ہی خواہش کا اظہار کیا ہے: ۔

تمنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی کام کر جاؤں
اگر کچھ ہو سکے تو خدمتِ اسلام کر جاؤں[۱]

اسدؔ ملتانی (۱۹۰۲ء۔۱۹۸۹ء):

جنھیں "تلمیذ اقبال" ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اور جنھوں نے اقبال کو زندگی میں اور بعد از مرگ بھی بارہا منظوم خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کے کلام میں جا بجا جبر و قدر، عقل و عشق، خودی، فقر، تصوف، آزادیٔ نسواں، فلسفۂ حرکت و عمل غرض یہ کہ فکرِ اقبال کے ہر پہلو پر اظہار خیال ملتا ہے۔ فرنگی تہذیب پر ان کے شعر دیکھیے: ۔

جس نے لادینی پہ رکھی تھی اساس زندگی
اپنی آنکھوں سے اب اس تہذیب کا انجام دیکھ[۲]

اسی طرح یورپ کے دوہرے معیار پر ان کے خوبصورت شعر ملاحظہ ہوں: ۔

پوچھا یہ میں نے ایک حکیم فرنگ سے
انصاف کا یہ کون سا معیار ہے کہ یوں
مغرب میں ہو قتال تو وہ جہد للبقا
مشرق میں ہو جہاد تو بیہودہ کشت و خوں[۳]

ن۔م۔راشدؔ (۱۹۱۰ء۔۱۹۷۵ء):

راشدؔ کو اقبال کی طرح مغربی اقوام کے استعماری رویوں کا تنقیدی اور بنظر غائر جائزہ لینے کا موقع ملا۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں اور غزلوں میں مسلمانانِ عالم کو مغربی اقوام کی سامراجیت سے آگاہ کیا ہے۔ ان نظموں میں راشدؔ نے بے حس مسلمانوں کو مغرب کی استعماریت کا احساس ہی نہیں دلایا بلکہ اقبالؔ کی طرح اس استعمار سے نمٹنے کی تعلیم بھی دی ہے: ۔

ہر جگہ پھر سینۂ نخچیر میں
اک نیا ارماں نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلۂ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں

۱۔ حفیظ جالندھری: شاھنامہ اسلام، جلد اول (لاہور، ایوان اردو، س۔ن) ص ۳۸

۲۔ عبدالمجید راہی سید و جعفر حسن جعفر (مرتبین) مطلعین: (مظفر گڑھ، مظفر گڑھ اکادمی، ۱۹۷۴ء) ص ۴۷

۳۔ ایضاً ص ۶۶

تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لیے
سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تار ہائے سیم وزر
ان کے مردوں کے لیے بھی آج اک سنگین جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال[۱]

راشدؔ اگر چہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں مگر غزل میں بھی وہ اقبال کے سحر سے آزد نہیں ہو پائے۔ جیسے ''ایران میں اجنبی'' کی غزلیات کے یہ شعر دیکھیے:

کس پہ کرتے ہو محلات کے دروازے بند
خلوتِ شاہ کا ہر راز گدا کو معلوم[۲]

وہی منزلیں وہی دشت و در ترے دل زدوں کے ہیں راہبر
وہی آرزو، وہی جستجو، وہی راہ پر خطرِ جنوں[۳]

فیض احمد فیضؔ (۱۹۱۱ء۔۱۹۸۴ء):

فیضؔ کے ہاں یوں تو بہت سے کلاسیکی شعرا کی بازگشت نظر آتی ہے مگر اقبال سے ان کی محبت اور دل بستگی نمایاں ہے۔ ان کے یہاں بھی اقبال کی رجائیت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ کہتے ہیں:

آزاد ہیں اپنے فکر و عمل، بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر، یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں[۴]

احسان دانش (۱۹۱۴ء۔۱۹۸۲ء):

احسان دانش نے غریبوں، مزدوروں اور محنت کشوں، کسانوں بیواؤں کی حمایت میں جو نظمیں لکھی ہیں ان میں اقبال کی روشن کی ہوئی مشعلوں کی روشنی ہے۔ احسان دانش اقبال کے انداز میں خدا سے شکوہ کرتے ہیں:

---

[۱] ن۔م۔راشد: ایران میں اجنبی (لاہور، گوشۂ ادب ۱۹۵۶ء) ص ۸۵

[۲] ایران میں اجنبی: ص ۱۶۷

[۳] ایضاً ص ۱۷۵

[۴] نسخہ ہائے وفا ص

بھوک سے جاں بلب رہیں مزدور
اور تو منعموں میں جلوہ طراز
تو رحیم و کریم ہے لیکن
یہ کرم کا ہے کون سا انداز[۱]

احمد ندیم قاسمی (۱۹۱۶ء-۲۰۰۶ء):

احمد ندیم قاسمی کے یہاں بھی اقبال کے نقوش کی مدہم اور دلکش لہریں محسوس ہوتی ہیں اور خیالات کے ساتھ اسلوب میں بھی اقبال کی جھلک ملتی ہے:۔

میں قرآں پڑھ چکا تو اپنی صورت ہی نہ پہچانی
مرے ایمان کی ضد ہے مرا طرزِ مسلمانی
عجب کیا ہے مجھے میرے مقاصد ہی سے اکتا دے
مرا ذوق خود آرائی، مرا شوقِ تن آسانی[۲]

نعیم صدیقی (۱۹۱۶ء-۲۰۰۲ء):

نعیم صدیقی کی شاعری کلام اقبال کی طرح اسلام کی تبلیغ و بقا کے لیے وقف نظر آتی ہے۔فرماتے ہیں:۔

میں نے جب جام اٹھایا تو مجھے یاد آیا
اک کرن کی طرح میں صبحِ حرا کا ہوں نقیب
میری محفل ہے کہیں دور ستاروں کے قریب
مجھے تفویض ہوئی ایک مقدس تہذیب
فرض میرا کہ بدل دوں میں جہاں کی ترتیب
یہ خیال آتے ہی سب جام و سبو پھوڑ دیے[۳]

شورش کاشمیری (۱۹۱۷ء-۱۹۷۵ء):

شورش اقبال کے پُر جوش مقلد تھے۔اقبال کی اسلام سے بے پناہ محبت شورش کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔خود کہتے ہیں:

۱۔ احسان دانش: مقامات (لاہور، مکتبہ دانش، س۔ن) ص۱۱۲
۲۔ احمد ندیم قاسمی: دوام (لاہور، ادارہ مطبوعات، ۱۹۸۲ء) ص۱۳۰
۳۔ نعیم صدیقی: پھر ایک کارواں لٹا (لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۹۲ء) ص۱۵۴

''علامہ اقبال سے میری ارادت کا راز بھی یہی ہے کہ وہ اسلام سے شیفتگی رکھتے تھے''[۱]

ان کا مندرجہ ذیل شعر دیکھیے:

حفظِ خودی پہ نظم جہاں کا مدار ہے
یہ راز آشکارا اگر کر سکے تو کر[۲]

ساحرلدھیانوی (۱۹۲۱ء۔۱۹۸۰ء):

ساحرلدھیانوی جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعر تھے۔ جاگیر کے متعلق اقبال کے نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ لہکتے ہوئے پودے، یہ دمکتے ہوئے کھیت
پہلے اجداد کی جاگیر تھے اب میرے ہیں
یہ چراگاہ، یہ ریوڑ، یہ مویشی، یہ کسان
سب کے سب میرے ہیں، سب میرے ہیں، سب میرے ہیں[۳]

ان چند نمایاں ناموں کے علاوہ بھی اردو کے بہت سے شعرا کے یہاں آج بھی اقبال کی شاعری کے اثرات اور ان کی تقلید نظر آتی ہے اور درحقیقت آج بھی شعرا ان کی فکر وفن سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اسے اقبال کی عظمت کی زبردست دلیل اور ان کی شان میں ہمیشہ جاری رہنے والا منظوم خراجِ تحسین کہا جا سکتا ہے۔

۱۔ شورش کاشمیری: گفتنی و ناگفتنی (لاہور، چٹان پرنٹنگ پریس۔ س۔ن) ص ۳۸

۲۔ ایضاً ص ۸۲

۳۔ ساحرلدھیانوی: تلخیاں (کراچی، فہیم پبلشنگ ہاؤس۔ س۔ن) ص ۸۸

باب چہارم:

منظوم خراج عقیدت، اصناف شعر کے حوالے سے

فصل اول: منظومات وقصائد

(i) مثنویات

(ii) مسدس ومخمس

(iii) قطعہ نما نظمیں

(iv) مثلث

(v) نظمِ پابند

(vi) نظمِ معرّیٰ

(vii) نظمِ آزاد

فصل دوم: قطعاتِ تاریخ وفاتِ اقبال

فصل سوم: قطعات ورباعیات

فصل چہارم: تضمیناتِ شعرِ اقبال

فصل پنجم: منظوم غنائیہ

فصل ششم: اقبال عالم مثال میں ___ فنتاژیہ (Fantasia)

فصل ہفتم: دوہے

اُردو شاعری بالخصوص اردو نظم کو بیسویں صدی کی سب سے بڑی دین اقبال ہے۔ اقبال کی شاعری میں ابتدا ہی سے مضمون اور ہیئت دونوں اعتبار سے جدت اور نیا پن جھلکتا ہے اور اقبال کی مقبولیت و محبوبیت میں اس جدت و انفرادیت کا بھی بڑا کردار ہے۔ اگر چہ اقبال نے اردو نظم میں اپنے خیالات کی ترسیل کے لیے پرانے اور مروجہ سانچوں ہی کو استعمال کیا البتہ جو اسالیب اور تکنیکیں انھوں نے اپنی شاعری میں استعمال کیں وہ نئی ہیں اور متقدمین کے ہاں نظر نہیں آتیں اور بعد کے شعرا نے ان سے خوشہ چینی کی۔

جہاں تک اصناف سخن کا تعلق ہے، اقبال نے تقریباً ہر صنف سخن کو برتا۔ اقبال کے یہاں نظم، مثنوی، مرثیہ، قطعات و رباعیات اور قصائد غرض ہر صنف شعر اوج کمال پر نظر آتی ہے۔ اسی طرح ہیئتوں میں سے بیشتر یعنی مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند وغیرہ بھی اقبال کے کلام میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے عہد اور مابعد کے شعرا ان کی شاعری کی انفرادیت، وسعتِ مضامین اور فکر عالی کے ساتھ ساتھ اصناف سخن میں ان کی ہمہ رنگی سے بھی متاثر ہوئے۔ اور تاثر پذیری کے ساتھ ساتھ ان کی تتبع کی کوشش بھی کرتے رہے مگر بقول ڈاکٹر حنیف کیفی:

> ''ان کا تتبع کسی شاعر کے بس کا روگ نہ تھا وہ ایک کوہ قامت اور بحر ساماں شخصیت کے حامل تھے اور ان کی بلندی، وسعت اور عمق تک پہنچنے کے لیے انھی جیسی شخصیت کی ضرورت تھی اور ایسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں'' [۱]

یہ ایک جداگانہ بحث ہے کہ شعرائے کرام ان کا تتبع کرنے میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟ تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ شعرائے اردو نے اقبال کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اقبال کا رنگِ سخن ضرور اختیار کیا اور اپنی محبت و عقیدت کے اظہار کے لیے ہر صنف سخن میں اقبال کو سراہا۔ اور آج ہمارے سامنے شاعری کی ہر صنف میں اقبال سے متعلق نظموں کے ذخائر کا ایک بحر بیکراں ہے۔ یہ نظمیں پابند و آزاد، قطعہ، رباعی، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، مسدس، مخمس غرض تقریباً ہر صنف اور ہیئت میں ہیں۔ ذیل میں ہم سب سے پہلے نظم اور اس کی متفرق ہیئتوں میں شعرائے کرام کے منظوم خراج عقیدت کا جائزہ لیں گے۔

۱۔ حنیف کیفی، ڈاکٹر: اردو میں نظم معرّیٰ اور آزاد نظم (لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)، ص ۷۱

فصل اول:

منظومات وقصائد

نظم۔ع اسم مونث کے لفظی معنی پرونا، موتیوں کوتا گے میں پرونا، لڑی[1] کے ہیں۔نظم کا موضوع ایک خیال اور ایک تصور ہوتا ہے۔اس میں موضوعات کی کوئی قید نہیں اور یہ کسی بھی ہیئت مثلاً قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، مسدس، مربع، ترکیب بند اور ترجیع بند میں لکھی جاسکتی ہے۔حمد، نعت، مناجات، منقبت قصیدہ، مرثیہ، غزل، ریختی، شہر آشوب، واسوخت، رباعی، مثلث، قطعہ، مربع، نظم معرّیٰ اور آزاد نظم اس کی اقسام ہیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی لکھتے ہیں:

> ''دراصل قدیم شعرا اور نقادوں کے ہاں نظم کا کوئی تصور نہ تھا۔ انھوں نے پورے شعری سرمائے کو ہیئت کے لحاظ سے غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ اور رباعی وغیرہ کے نام سے تقسیم کر رکھا تھا''۔[2]

صحیح معنوں میں اردو نظم کی ابتدا نظیر اکبر آبادی نے کی اور تقریباً تمام اصنافِ سخن کو برتا۔ پھر ہمیں حالی ایسے شاعر نظر آتے ہیں جنھوں نے نیچرل نظموں پر زور دیا۔ نظم کے آغاز و ترویج میں انجمن پنجاب کے مشاعروں کا بڑا دخل ہے۔حالی و آزاد اس کے روحِ رواں تھے۔آگے چل کر نظم نے ایک صنف شعر کی حیثیت سے سب سے زیادہ ترقی کی۔اور شبلی، اسماعیل، اکبر، چکبست، سرور، ظفر علی خان، جوش، اور علامہ اقبال نے اردو نظم میں نت نئے ہیئتی تجربات کر کے اسے بام عروج پر پہنچا دیا۔

علامہ اقبال کے کلام میں ہمیں نظم کی اقسام بھی ملتی ہیں اور ہیئتیں بھی۔ذیل میں ہم ان منظومات وقصائد سے بحث کریں گے جو اقبال کی مدح و تحسین میں لکھی گئیں۔یہاں ہم نے نظم اور قصیدہ کو ایک ہی فصل میں بیان کیا ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اقبال کے متعلق ان منظومات کا موضوع ایک ہی ہے یعنی مدح اقبال۔دوسرے یہ کہ جو منظومات ہمیں قصیدے کے عنوان سے دستیاب ہوتی ہیں، وہ باعتبار ہیئت قصیدے کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اور نہ ہی ان کے شعرا نے انھیں شعوری طور پر قصیدے کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔وہ نظمیں ہی ہیں مگر ان پر عنوان ''قصیدہ'' دے دیا گیا ہے۔اس لئے ان قصائد کو ہم نے منظومات کی ہی فہرست میں داخل کیا ہے۔

ذیل میں ہیئت کے اعتبار سے منظومات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔سب سے پہلے ہم مثنویات کا ذکر کریں گے جو اقبال کی مدح میں لکھی گئیں۔

---

[1] فرہنگ آصفیہ: جلد سوم (لاہور، سنگ میل، ۱۹۸۶ء) ص ۵۷۸

[2] رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر: اصنافِ ادب (لاہور، سنگ میل، ۱۹۹۱ء) ص ۹۶

(i) مثنویات

مثنوی عربی زبان کے لفظ ثنیٰ سے مشتق ہے جس کے معنی دو کے ہیں اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

علامہ اقبال کو شعرائے کرام نے نظموں کی صورت میں جو خراجِ تحسین پیش کیا ان میں بہت سی طویل مثنویات آج ہمارے سامنے کتابی شکل میں بھی ہیں۔ ان میں فضل احمد کریم فضلی کی ''نذرِ اقبال''، اور طاہر لاہوری کی ''خودی ہے نور فشاں''، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فضل احمد کریم فضلی کی طویل مثنوی ''نذرِ اقبال'' اقبال اکیڈمی کراچی نے شائع کی۔ سرورق پر تحریر ہے۔

''وہ نظم جو اقبال اکیڈمی کے زیرِ اہتمام یوم اقبال کے موقع پر کراچی میں ۲۱ اپریل ۱۹۷۷ء کو پڑھی گئی''[۱]

چھیاسی ۸۶ اشعار پر مشتمل اس طویل نظم میں فضلی صاحب نے اقبال کی آمد سے پہلے کے زوال پذیر اور زبوں حال ہندوستان کا نقشہ کھینچا ہے۔ پہلے تین تمہیدی اشعار میں اقبال کی صفاتِ محمودہ کو سراہتے ہوئے شاہ ولی اللہ کے دور سے ہندوستان کی تاریخ بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ اور سید احمد شہید نے ہندوستان میں شمع حق روشن کی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں میں جوش وولولہ کی تو کچھ کمی نہ تھی البتہ نظم وضبط، فن حرب اور علم جدید میں مسلمان پیچھے تھے۔ نتیجہ ہار جانے کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا؟ مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوگیا اس دور میں سرسید احمد خان نے چراغ علم روشن کیا۔ پھر سرسید کے اردگرد دردمندانِ ملت اکٹھے ہوگئے۔ ان میں حالیؔ شیریں نوا بھی تھے جنہوں نے مسدس لکھ کر نیند کے ماتوں کو میٹھی نیند سے جگا دیا۔ پھر اکبر کی مدح کرتے ہیں کہ انھوں نے ہنس ہنس کر قوم کو راہِ فلاح دکھائی۔ اقبال کی آمد کا نقشہ بڑے دلکش انداز میں کھینچتے ہیں: ؎

سلسلہ بیداری ملت کا یوں چلتا گیا
اک دیا بجھتا گیا اور اک دیا جلتا گیا
دور نکبت ختم ہو کر دور اقبال آگیا
آگیا اس شان سے ماضی کو بھی حال آگیا
اہل علم و فضل تھے پہلے بھی ملت میں مگر
تجھ سے پہلے کوئی بھی ایسا نہ تھا صاحب نظر
جو علوم مشرقی و مغربی میں فرد ہو
دانش افرنگ جس کے کاروان کی گرد ہو[۲]

---

۱ فضل احمد کریم فضلی: سرورق نذر اقبال (کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۷۰ء)

۲ نذر اقبال: ص۳۔۴

اس کے بعد فضلی صاحب نے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں پیام اقبال کی تشریح کی ہے اور اقبال کی شاعری کے بہت سے موضوعات مثلاً اشتراکیت، سرمایہ داری، عشق رسول ﷺ، رموزِ بے خودی، اسرارِ خودی اور وطنیت وغیرہ کو اس مہارت سے اشعار میں سمیٹا ہے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔ آخر میں پاکستان میں اشتراکیوں کے انکار اقبال کا ذکر کرتے ہیں اور دو ٹوک اور فیصلہ کن انداز میں اعلان کرتے ہیں:۔

کچھ بھی ہو جائے ترا پیغام مٹ سکتا نہیں
اور سب مٹ جائیں گے اسلام مٹ سکتا نہیں [۱]

فضل احمد کریم فضلی کی یہ طویل نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ اور اقبال کے بارے میں لکھی گئی مثنویات میں پہلی طویل مثنوی کہی جا سکتی ہے۔

دوسری اور طویل ترین مثنوی ''خودی ہے نور فشاں'' طاہرؔ لاہوری کی ہے۔ اشعار کی تعداد چھ سو پچاس ۶۵۰ کے قریب ہے۔ اس طویل مثنوی کے آغاز میں طاہرؔ لاہوری نے عالم بالا کا فرضی نقشہ کھینچا ہے جہاں ربِ عرش بریں کا سایہ ہے، ہر طرف صدائے اللہ ہو ہے اور رات دن کی قیود سے ماورا اس جہان میں ذرے ذرے کا دل فروزاں ہے۔ پھر حمد رب تعالیٰ کرتے ہیں۔ حمد کے بعد نعت کا بیان ہے۔ اور یہیں سے گریز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے نائب دین حق کے سفیر ہیں اور ان میں اقبال خودی کا رسول ہے۔ جو علم قرآن کی حسیں تصویر اور نگہ مومن کی سطوت و شمشیر ہیں۔ جن کی شاعری میں سنائیؔ، عطارؔ، رومیؔ اور جامیؔ کی حکمتیں جھلکتی ہیں۔ اقبال کی شاعری کی مدح وستائش طاہرؔ لاہوری کے الفاظ میں دیکھیے:۔

شاعری ہے محیط ارض و سما
حلقۂ فکر میں ہے دام نیا
سازو آواز ہے صریر قلم
لفظ درلفظ ہیں مہ و انجم
حرف درحرف ہیں گل و نغمات
شعر در شعر حسن کی برسات
نظم در نظم ہیں گلاب کے پھول
فکر در فکر آفتاب کی دھول [۲]

۱۔ نذر اقبال: ص۷

۲۔ طاہر لاہوری: خودی ہے نور فشاں (لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء) ص ۱۶

اقبال کی شاعری کی تحسین کے بعد اقبال کے تصور مرد مومن کی تشریح کرتے ہیں اور بندہ مومن کی صفات کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں:

ان سے طوفاں کلام کرتے ہیں
چاند سورج سلام کرتے ہیں
بجلیوں سا نظر میں رعب و جلال
یہ ہے شانِ مجاہد اقبال[۱]

کہتے ہیں کہ اقبال کی فکر کوئی معمولی فکر نہیں بلکہ اقبال نے مشرق و مغرب کے علوم و فلاسفہ سے استفادہ کر کے اس کی تشکیل کی ہے۔ اس کے بعد دنیا بھر کے خاص ممالک اور اہم شہروں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی وجہِ شہرت بیان کرتے ہیں۔ یہ ایک طویل منظوم بیان ہے مثنوی کا اہم حصہ وہ ہے جہاں وہ اقبال کی تنقید مغرب اور اس کے سیاسی، صنعتی انقلابات اور فلاسفہ پر نکتہ چینی کے موضوع کو نظم کرتے ہوئے فکر اقبال کی برتری دکھاتے ہیں۔ ایڈم سمتھ، تھورو، ہٹلر، ارسطو، نیوٹن، ڈارون، فرائڈ کے نظریات نے اہل دنیا کو جس بے سکونی میں مبتلا کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہیں اور ان پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

عشق کی روشنی نہیں ان میں
روح کی تازگی نہیں ان میں
ساز روحانیت سے خالی ہیں
سوز وجدانیت سے خالی ہیں[۲]

البتہ فکرِ اقبال ان سب سے جدا اور منفرد ہے۔ کہتے ہیں:

فکر اقبال کچھ نرالا ہے
اس کو خون جگر نے پالا ہے
لامکاں کی مکاں کی محفل ہے
یہ فنا کی، بقا کی منزل ہے
اس فنا میں بقا کا راز بھی ہے
اور انا الحق کا سوز و ساز بھی ہے[۳]

۱۔ خودی ہے نور فشاں: ص ۱۴
۲۔ ایضاً ص ۹۵
۳۔ خودی ہے نور فشاں: ص ۹۵۔۹۶

اس کے بعد روح قائد سے خطاب کر کے موجودہ پاکستان کی اخلاقی تہی دامنی کا ذکر کرتے ہیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد جس طرح اہل پاکستان نے قائد اور اقبال کی تعلیمات کو فراموش کر دیا، اس پر اظہار غم کرتے ہیں۔ یہاں مثنوی میں غم کے ساتھ طنز بھی شامل ہو گیا ہے:۔

شکل انساں میں بھیڑیوں کے ہیں غول
وحشیوں کا سا ہو گیا ماحول
کوئی تاجر کوئی سمگلر ہے
کوئی افسر کوئی گدا گر ہے
آٹھ کاریں ہیں چار بنگلے ہیں
اور اندر سے سارے کنگلے ہیں
سارے مجرم شریف شہری ہیں
اپنے حلقے میں اک کچہری ہیں
سب کو یہ داستاں سناتے ہیں
ہم تو رزقِ حلال کھاتے ہیں[۱]

اور اس سب کے باوجود اقبال کی طرح طاہر لاہوری بھی مایوس نہیں ہیں ان کے نزدیک اس پاک سرزمین کا خمیر غیرت وحمیت سے اٹھا ہے۔ یہ زمین ان وفا شعاروں اور دردمندوں کی ہے جنہیں فکر اقبال کا ادراک بھی ہے۔ آخر میں دعا کناں ہیں:۔

اے خدا اس فقیر طاہر پر
کر کرم بے نوا سے شاعر پر[۲]

۱۔ خودی ھے نور فشاں: ص ۱۰۷

۲۔ ایضاً ص ۱۱۷

(ii) مسدس و مخمس

مسدس کے لغوی معنی چھ، کے ہیں ایسی نظم جس میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ یا ہم ردیف ہو لیکن پانچواں اور چھٹا مصرع الگ سے ہم قافیہ ہوں۔ مسدس نے جو صورت اردو میں اختیار کر لی ہے وہ نہ فارسی میں ہے اور نہ عربی میں۔ اصناف سخن کے اعتبار سے یہ صورت نہ ترکیب بند کی ہے اور نہ مسمط کی، دراصل اردو شعرا نے اپنے لیے ایک نئی راہ نکالی ہے اور پھر اس کو اس قدر ترقی دی ہے کہ اردو میں جس قدر اصناف رائج ہیں ان میں سے کسی میں مضامین عالیہ کا اتنا وافر ذخیرہ موجود نہیں ہے۔ مسدس کے لیے موضوعات کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ مذہبی، سیاسی، اخلاقی، معاشی، بہاریہ اور مدحیہ مضامین اس میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ حالی کی نظم ''مدوجزر اسلام'' کو اس کی ہیئت کی وجہ سے مسدس حالی کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال کی ''شکوہ'' اور ''جواب شکوہ''، بھی مسدس کی ہیئت میں ہیں۔

علامہ اقبال کی مدح وستائش میں مسدس کی ہیئت میں کہی گئی پہلی نظم مولانا محمد اسماعیل مغموم کی تھی جن کا ذکر باب دوم میں کیا گیا ہے۔ اقبال کی وفات کے غم کے اظہار کے لیے بہت سے شعرا نے مسدس کی ہیئت کو اختیار کیا اور بڑے دلکش اور پر تاثیر شعری نمونے ہمارے سامنے آئے۔ مشہور مزاحیہ شاعر سید ضمیر جعفری (پ ۱۹۱۸) نے اقبال کی وفات پر ''آہ شاعر مشرق''، کے عنوان سے جو نظم کہی، اس کی ہیئت مسدس ہے۔ ضمیر جعفری کہتے ہیں کہ اقبال کی وفات نے فرات، روم، ایشیا، حجاز غرض دنیا کے ہر خطے کو تڑپا دیا ہے، وہ اقبال کی ذات کو مجموعہ صفات کہتے ہیں اور ان کے فکر و تخیل اور امت مسلمہ کے لیے ان کی بھرپور خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

ہے نقش دل پہ شاعر مشرق کی بات بات
وہ زندگی کا فلسفہ وہ موت کے نکات
مجموعہ صفات تھی اقبال تیری ذات
امت کی موت شاعر امت تیری وفات
مرنا ترا نہیں فقط شاعری کی موت
مرنا ہے ایک قوم کا اقبال تیری موت[1]

---

[1] نذر اقبال: ص ۶۰

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (۱۸۹۵۔۱۹۵۹ء) اقبال کے پرستاروں میں سے تھے۔ مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی ان کی نظم 'اقبال' ان کی اقبال سے گہری محبت کی آئینہ دار ہے۔ فرماتے ہیں:۔

سینہ تھا ترا مشرق و مغرب کا خزینہ
دل تھا ترا اسرار و معارف کا خزینہ
ہر شعر ترا جامِ ترقی کا ہے زینہ
مانندِ مہِ نو تھا فلک سیر سفینہ
اس ساز کے پردے میں تھی عرفان کی آواز
کیا عرش سے ٹکرائی یہ انسان کی آواز[1]

شعرائے کرام کے نزدیک اقبال کی وفات علم وادب کے اقبال کا خاتمہ ہے اس موضوع پر اکثر شعرا نے اظہار خیال کیا ہے۔ ادیبؔ مالیگانوی کہتے ہیں:۔

اس چمن سے کیسے کیسے نغمہ پرور چل بسے
ہمنوائے بلبل شیراز اکثر چل بسے
اہل جوہر کو دکھا کر اپنے جوہر چل بسے
محفل شعر و ادب سے داغ و اکبر چل بسے
قوم کا اقبال تھا اقبال بھی جاتا رہا
آہ وہ اک نقش بے تمثال بھی جاتا رہا[2]

جہان اردو میں ہزاروں شاعر جلوہ گر ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے نامور شعرا نے جادواثر شاعری کی ہے مگر اقبال ان سب سے جدا اور الگ ہیں۔ شعرا نے قدر شعر اقبال کے حوالے سے سخن شناسی کا ثبوت دیا اور نہیں مجتہد و مجدد عصر قرار دیا ہے۔ صباؔ حسنی کہتے ہیں:۔

ہے یہ مجدد، ہے مجتہد یہ جہان شعر و سخنوری کا
وہ صور پھونکا پیامِ حق کا، بدل گیا رنگ شاعری کا

---

[1] نذر اقبال: ص۲۳

[2] بیاد شاعر مشرق: ص۴۰

نگاہ بدلی ہے رہبری کی، طریقہ بدلا ہے جوہری کا
ادائیں بدلی ہیں عاشقی کی، سلیقہ بدلا ہے دلبری کا
تھا شاعری کا نہ کوئی مقصد، بہ جز کہ تفریح کا ہے ساماں
بتایا اقبال نے ہے شاعرؔ زبان حق، ترجمان انساں[۱]

اس طرح جو نظمیں مخمس کی ہیئت میں لکھی گئیں، ان میں بھی اقبال کی عظمتِ شاعرانہ، فلسفۂ زندگی اور اقبال کی غیر معمولی شخصیت کا اعتراف ہے برقؔ موسوی کی مخمس کا آخری مصرع ٹیپ کا ہے۔ اقبال کی سیرت کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں: ۔

خود اپنی ذات کا عارف ہے اور مقصود سے واصف　　تضادِ عقل وادراک حقیقت سے نہیں خائف
بنا سوز دروں جس کا ، رموزِ عشق کا کاشف　　ہے جس کا جذب کامل امتزاج معنی و صورت
وہی اقبال ہے تلمیذ رحمٰن شاعر فطرت[۲]

---

۱ صبا حسنی: چراغ جلتے رہے (لاہور، ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۹۰ء) ص ۱۲۰

۲ نذر اقبال: ص ۵۷

(iii) قطعہ نما نظمیں

(ق طِ عَ ہْ) کے لغوی معنی ٹکڑا یا جزو کے ہیں۔ اصطلاح میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیال یا واقعہ مسلسل بیان کیا گیا ہو۔ قطع میں ہر شعر کے دوسرے مصرع میں قافیے کی پابندی لازمی ہے۔ قطع کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ علامہ اقبال کی وفات پر جو قطعات تاریخ کہے گئے ان کا ذکر قطعات تاریخ کی فصل میں کیا جائے گا۔ اقبال کے متعلق منظومات کی ایک معتدبہ تعداد ایسی ہے جن میں قطعات کی شکل میں نظم کو بندوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم انھی منظومات کا ذکر کریں گے جو صرف چار مصرعوں پر نہیں بلکہ طویل نظموں پر مشتمل ہیں اور جن کے قطعات کی شکل میں بند بنائے گئے ہیں یہ نظمیں مربع، کی ہیئت سے یکسر مختلف ہیں اس لیے انھیں قطعہ نما نظموں میں شامل کیا گیا ہے۔

قطعے کی ہیئت میں شعرا نے رحلتِ اقبال کے فوراً بعد بھی نظمیں کہیں اور بعد ازاں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ پروفیسر محمد منوّر (۱۹۲۷ء۔۲۰۰۰ء) معروف ماہر اقبالیات و شاعر اپنی نظم اقبال عاشق رسول ﷺ میں کہتے ہیں کہ اقبال کی پسند و ناپسند کا معیار عشق رسول ﷺ تھا اور حب رسول ﷺ ان کے وجود کی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ فرماتے ہیں: ؎

ذوق ادائے فرض میں بہتا رہا فقیر
دینِ نبیؐ کی روح تھی یوں شامل خراج
غیروں کے طعن و طنز تو اپنوں کے زہر خند
معیار حق تھا اس کی پسند اس کی نا پسند[۱]

ڈاکٹر وزیر آغا (پ ۱۹۲۲ء) کی خوبصورت استعاروں، تشبیہوں اور کنایوں میں لکھی ہوئی نظم 'اقبال' بھی قطعہ ہی کی ہیئت میں ہے کہتے ہیں کہ جانے وہ ہوا کا جھونکا تھا یا ماہتاب کی کرن تھی، یا اوس کی لرزتی ہوئی کائنات یا آنسو تھا جو پلکوں کے ساتھ چپکا تھا، یا شجر سے ٹوٹا پتا تھا کوئی نہیں جانتا وہ شخص کیا تھا؟ وزیر آغا کہتے ہیں: ؎

؎ کس کو خبر کہ آیا تھا وہ کس جہان سے
اور کون سے جہان کی جانب چلا گیا
اتنی مگر خبر ہے کہ وہ تیرہ رات میں
سیّال بجلیوں کے بدن گد گدا گیا[۲]

۱۔ کشت نو: اقبال نمبر (زرعی یونیورسٹی فیصل آباد، ۱۹۷۷ء) ص ۴۳۲

۲۔ بیاد شاعر مشرق: ص ۲۹۷

نظمِ آزاد کے بے مثل شاعر مجید امجد (۱۹۱۴۔۱۹۷۴ء) نے ''شاعروطن'' کے عنوان سے اپنی نظم میں علامہ کی سخنوری کو سراہا اور کہا کہ اقبال جیسے سخن ور کا اس کے بعد دنیا میں آنا ناممکن ہے۔ کہتے ہیں:۔

جہاں میں دور ابھی آئیں گے لاکھوں
فلک کے طور ابھی آئیں گے لاکھوں
نہ آئے گا کوئی تجھ سے سخنور
سخنور اور ابھی آئیں گے لاکھوں[۱]

پروفیسر غلام جیلانی اصغر (پ ۱۹۱۸ء) کی نظم ''مرد درویش'' قطعہ کی ہیئت میں کہی گئی نظموں میں منفرد ترین نظم کہلانے کی حقدار ہے۔ متغزلانہ اور رومانوی انداز لیے ہوئے یہ نظم اقبال کی زندگی اور ان کے کارہائے نمایاں کو دلکش انداز میں پیش کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہمارے شہر سے ایک مردِ فقیر گزرا جو گلیم پوش و صاحب سریر تھا، وہ خود شناس و خود آگاہ و باضمیر تھا۔ وہ شخص سارے نگر سے واقف تھا۔ اس نے غلاموں کو سرفرازی دی، حسن ذات کا شعور دیا۔ وہ شخص اب ہم میں نہیں ہے مگر اس کا کلام کبھی ''زبور عجم'' اور کبھی ''بانگ درا'' کی شکل میں اہل مشرق کے لیے پیام زیست ہے۔ نظم کے آخری قطعے کا دلکش اسلوب بالخصوص قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرالیتا ہے:۔

وہ شخص شہر سے گزرا تو کتنا تنہا تھا
جلو میں اس کے مگر زندگی کا دریا تھا
چلا گیا ہے تو اب شہر کتنا تنہا ہے
وہ ایک شخص جو ہر شخص کا شناسا تھا[۲]

۱۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر (مرتب): کلیات مجید امجد (لاہور، ماورا پبلیشرز، ۱۹۸۹ء، اشاعت اول) ص ۴۴

۲۔ ضیا بار: اقبال نمبر ۲، ۱۹۷۷ء ص ۲۵۱

(iv) مثلث

مثلث مسمط کی ایک ایسی قسم ہے جس میں ہر بند تین مصرعوں کا ہوتا ہے۔اس کے پہلے دو مصرعے ہم قافیہ اور تیسرے کا قافیہ جدا ہوتا ہے۔اقبال کو خراج تحسین پیش کرنے والے شعرانے ہر صنف اور ہر ہیئت میں اقبال کو سراہا۔مثلث کی ہیئت میں ایک بڑی دلکش نظم خالد بزمی (پ۱۹۳۲ء) کی ہمارے سامنے آتی ہے۔نظم طویل بحر میں لکھی گئی ہے۔خالد بزمی کہتے ہیں کہ اقبال حقیقت میں جان محفل اور روح گلستان تھا۔اس کے دم سے محفل پر رونق و رنگین تھی۔وہ گلستان سخن کا بلبل شیریں نوا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

کہاں وہ طرز لاثانی کہاں وہ فکر لاثانی
کہ اس میدان میں آساں نہیں اس کا کوئی ثانی
گلستان سخن کا بلبل شیریں نوا تھا وہ

رہے گا اس کی علمی خدمتوں کا تذکرہ اکثر
قیامت تک کرے گی ناز تاریخ ادب اکثر
کہ تاریخ ادب میں اک متاع بے بہا تھا وہ[1]

---

[1] بیادشاعر مشرق :ص۱۰۵

(۷) نظم پابند

منظومات کا ایک ضخیم سرمایہ غزل نما نظموں پر مشتمل ہے۔ یہ نظمیں غزل کے برعکس عنوانات لیے ہوئے ہیں اور نظم کی طرح ایک ہی موضوع پر ہیں۔ مگر ان کی ہیئت غزل سے مماثل ہے اور اسلوب میں بھی تغزل اور رومانویت لیے ہوئے ہیں۔

امجد اسلام امجدؔ (پ ۱۹۴۴ء) اقبال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

روح کو چھوتے ہوئے ایک نظارے جیسا
تھا وہ اک شخص یہاں صبح کے تارے جیسا
فکر تھی سب سے جدا خوب انوکھے اس کے
پھر بھی لگتا تھا بہر رنگ ہمارے جیسا
آئیں گے اور بھی دنیا میں سخنور لاکھوں
پر نہ ہو گا کوئی اقبال تمھارے جیسا[۱]

مشکور حسین یادؔ (پ ۱۹۲۶ء) کہتے ہیں کہ اقبال کی عظمت رہتی دنیا تک لوگوں کے دلوں پر نقش رہے گی۔ کہتے ہیں: ؎

جلا کے مشعل عرفان، و آگہی تو نے
جنوں کی اک نئی منزل تلاش کی تو نے
تمام عمر ترے گیت گائے جائیں گے
ادب کو بخش دیا کیف سرمدی تو نے[۲]

ڈاکٹر خورشیدؔ رضوی (پ ۱۹۴۲ء) کی اقبال کے متعلق دو پابند اور ایک بہت پر تاثیر آزاد نظم ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایک نظم میں کہتے ہیں: ؎

وہ ایک شخص وہ سرمایۂ جنوں اپنا
وہ جس کے خون کی سرخی جگر جگر میں گئی
صدف کہیں تو سرابوں میں قید تھا وہ صدف
صبا کہیں تو گلستانِ بے ثمر میں گئی[۳]

۱۔ امجد اسلام امجد: سحر آثار (لاہور، جہانگیر بک ڈپو، ۱۹۹۸ء) ص ۲۸

۲۔ اقبال: مجلّہ گورنمنٹ کالج، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۸

۳۔ ضیا بار: ۱۹۷۳ء ص ۲۵۳

گویا ان کے نزدیک اقبال جیسے عظیم شخص اور شاعر کی ان کی قوم نے وہ قدر نہ کی جو کہ اس کا حق تھا۔ وہ ایک صدف کی مانند تھا مگر سرابوں میں قید صدف اور ایسی صبا کی مانند تھا جن کا مقدر ثمر دار گلستان نہیں تھا۔ اپنی دوسری نظم میں بھی وہ قریب قریب انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور آخری شعر تو گویا اس نظم کا حاصل ہے: ؎

میں وہ محروم کہ پایا نہ زمانہ تیرا

تو وہ خوش بخت کہ جو میرے زمانے میں نہیں [۱]

اسلامی فکر و تہذیب کے علمبردار نعیم صدیقی (پ ۱۹۱۲ء) اقبال کی فکر اور ان کے فن دونوں کی تحسین کرتے ہیں اور اقبال کی عظمت کو عظمت لایزال قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ؎

وہ باعث ارتقائے تہذیب

ممکن ہی نہیں زوال اقبال

انسان کی فکر کے افق پر

صد جلوہ لایزال اقبال

اے سال صدی منانے والو

ہر سال ہے اپنا سال اقبال [۲]

ڈاکٹر تحسین فراقی (پ ۱۹۵۰ء) معروف شاعر و ماہر قبالیات اپنی نظم ''نذر اقبال'' میں اقبال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں فقیر تاجور، شاعر اعتبار آدم قرار دیتے ہیں۔ نظم میں جابجا فکر و شعر اقبال سے استفادہ کیا گیا ہے: ؎

دشمنوں کے لیے تھا تیغ قاطع

اپنوں کے دفاع میں سپر تھا

شاہیں کی نگہ تری نگہ تھی

چیتے کا جگر ترا جگر تھا [۳]

نغمگیت، موسیقیت اور تغزل غزل کا لازمی جزو ہے۔ اور یہی صفت ہمیں ان منظومات میں بھی ملتی ہے جو غزل کی ہئیت میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً عاصی کرنالی (پ ۱۹۳۲) کے یہ اشعار جو صنعت مسمط کی طرز پر لکھے گئے۔ ملاحظہ ہوں: ؎

---

[۱] ضیا بار: ۱۹۷۳ء، ص ۲۱۷

[۲] سیارہ: اقبال نمبر ۱۹۷۸ء، جلد ۳۴، شمارہ ۳، ۴، ص ۳۶

[۳] تحسین فراقی، ڈاکٹر: نقش اول (لاہور، مقبول اکیڈمی ۱۹۹۲ء) ص ۹۸

تیرا کلام دل نشین تیرا پیام دل نشاں
پھول کی طرح جلوہ ریز ، چاند کی طرح ضوفشاں
خون جگر ترا کلام، سوز دروں ترا پیام
تیرا کمال بے زوال ، تیری بہار بے خزاں[1]

---

[1] عاصی کرنالی: چمن (ملتان، مکتبہ اہل قلم، ۱۹۸۶ء) ص ۹۰-۸۹

(vi) نظم معرّیٰ

یہ صنف دراصل انگریزی ادب کی پیداوار ہے۔ اسے انگریزی میں Blank Verse کہتے ہیں۔ نظم، معرّیٰ میں بحر اور وزن کی پابندی کی جاتی ہے۔ اردو میں اس کے ابتدائی تجربے شررؔ، نادرؔ کاکوروی، اور نظم طباطبائی نے کیئے۔ مجید امجدؔ، ساحرؔ، راشدؔ، فیضؔ، تصدق حسین خالدؔ اور احمدؔ ندیم قاسمی کے نام اس صنف کو فروغ دینے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔

آغا صادق (۱۹۰۹ء۔۱۹۷۷) کی نظم، یاد اقبال، نظم معرّیٰ کا ایک دلکش نمونہ قرار دی جاسکتی ہے: ۔

اقبال پھر یاد آ گیا

پھر روح کو تڑپا گیا

پھر زندگی کا راستہ

کھویا ہوا تھا پا گیا

اقبال پھر یاد آ گیا[۱]

نظم میں سہل ممتنع کا انداز ملاحظہ ہو

ایسا نہ آیا تھا کوئی

ایسا نہ آئے گا کوئی

جو گیت اس نے گائے ہیں

شاید نہ گائے گا کوئی

اقبال پھر یاد آ گیا[۲]

۱۔ آغا صادق: صبح صادق (لاہور، گلزار عالم پریس، س۔ن) ص ۷۔۸

۲۔ ایضاً

(vii) نظم آزاد

یہ صنف بھی مغرب کی پیداوار ہے اور اردو میں بے حد مقبول ہوئی ہماری جدید شاعری کا ایک بڑا سرمایہ اس نظم میں موجود ہے۔ انگریزی میں اسے Free Verse کہا جاتا ہے۔ آزاد نظم کی بنیاد ایک ہی بحر پر ہوتی ہے۔ مگر بحر کے ارکان کی تقسیم شاعر کی صوابدید پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایک رکن دو مصرعوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ کوئی مصرع چھوٹا اور کوئی بڑا۔ آزاد نظم میں بھی ہیئت کے اعتبار سے مختلف تجربات کیے گئے ہیں۔ بعض شعرا آہنگ اور صوتی تاثر کا خاص خیال رکھتے ہیں اور کبھی نظم میں قافیے بھی لاتے ہیں۔ راشد اور تصدق حسین خالد کو اردو میں آزاد نظم کا بانی کہا جاتا ہے۔ میرا جی، سردار جعفری، فیض، مصطفیٰ زیدی، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، منیر نیازی، مجید امجد، عارف عبدالمتین، نعیم صدیقی، ضیا جالندھری، وزیر آغا اور دیگر بے شمار شعرا نے آزاد نظمیں کہی ہیں۔

جہاں اقبال کے مداح شعرا نے اقبال کو دیگر اصناف سخن میں سراہا ہے، وہاں آزاد نظم کے شعرا بھی تحسین اقبال میں کسی سے پیچھے نہیں رہے اور نظم آزاد کے اہم شعرا مثلاً افتخار عارف، تصدق حسین خالد، عارف عبدالمتین، طاہر تونسوی، تابش صدیقی، عظیم قریشی اور گفتار خیالی نے اقبال کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

ان منظومات میں شعرا نے اقبال کی سیرت و شخصیت، ان کی عظمتِ شاعرانہ اور ان کے فکر و فلسفہ کے مدح و تحسین کی ہے۔ تصدق حسین خالد (۱۹۰۰ـ۱۹۷۲) اپنی نظم ''اقبال'' میں اقبال کی جسمانی موت کو تو تسلیم کرتے ہیں مگر روحانی موت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ ان کے خیال میں مرگ ہمیشہ اقبال سے محروم رہے گی۔ کہتے ہیں:

مرگ نے بھینچ لیا تیرے تن خاکی کو
تو مگر مر نہ سکا
مرگ بیٹھی ہی رہے گی ترے مرقد کے حضور
تو چھلکتا ہی رہے گا سر دامان سحاب[۱]

یہی موضوع منور عزیز کی نظم بعنوان ''روشنی کا امین'' کا بھی ہے۔ کہتے ہیں:

دل نہیں مانتا
چہرہ چہرہ بکھرتی ہوئی روشنی کا امیں
مر بھی سکتا ہے!

۱۔ بیاد شاعر مشرق: ص ۷۸

وہ مرا تو نہیں

وہ تو زندہ ہے

اور اس کی خوشبو ہر اک سمت کو چھو رہی ہے

عمل کے چراغوں کو لو دے رہی ہے [۱]

اقبال عظیم ہے، یہ موضوع شعرا کا پسندیدہ موضوع ہے۔ نظم آزاد کے شاعر ادیب سہیل (پ ۱۹۲۴ء) اقبال کو نباضِ زمانہ، پیمبرِ سخن اور آفتابِ جہاں تاب قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں: ۔

وہ نباض زمانہ ہے

وہ لحوں کا پیمبر ہے

یقیناً ایک سورج ہے [۲]

ذکی آذر کی نظم آزاد میں ٹیپ کے مصرعے ''اسی ایک محرم راز سے کہیں رنگ ہے کہیں روشنی'' کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اپنی نظم میں کہتے ہیں کہ اقبال کے نور سے پوری دنیا منور ہو گئی ہے۔ اور اس کے نفس کی آگ ہی اس کی شاعری کا اصل رنگ اور نور ہے۔ اقبال کے سوز دروں کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں: ۔

وہ جو آگ اس کے نفس میں تھی

وہی آگ جوئے رواں بنی

وہی آگ فکر و نظر میں ہے

وہی آگ مرکز جاں بنی

وہی آگ قلب و جگر میں ہے

وہی آگ پھیلی صدی صدی

اسی ایک محرم راز سے کہیں رنگ ہے کہیں روشنی [۳]

۱۔ افکار: کراچی، ۱۹۷۷ء اقبال نمبر، ص ۵۷

۲۔ بیادشاعر مشرق: ص ۳۹

۳۔ ایضاً ص ۱۱۶

یوں تو تقریباً سبھی آزاد منظومات بہت دلکش اسلوب کی حامل ہیں تاہم نظموں کے اس ذخیرے کی تین منظومات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ یہ نظمیں طاہر تونسوی (پ ۱۹۴۸ء) عظیم قریشی (پ ۱۹۱۱ء) اور خورشید رضوی (پ ۱۹۴۲ء) کی ہیں۔

طاہر تونسوی کی نظم بعنوان ''روح آدم کا مسیحا'' کے مترنم مصرعوں نے اسے غزل کی سی نغمگیت عطا کی ہے۔ نظم میں ''مجھے خبر ہے'' کے مصرعے کی تکرار کانوں کو بھلی لگتی ہے اور نظم کے آہنگ کو دوچند کر رہی ہے۔ نظم کے آغاز سے زیادہ اس کا انجام قاری کو بے ساختہ داد دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ اقبال کے سبھی مجموعوں کی اس خوبصورتی سے تعریف کرتے ہیں:۔

مجھے خبر ہے
کہ جس نے ''بانگ درا'' کی صورت
پیام بخشا ہے ''خضر راہ'' کا
وہ جس کی ''ضرب کلیم'' نے ہم کو خواب غفلت سے یوں جگایا
کہ ہم نے زنجیریں توڑ ڈالیں
مجھے خبر ہے
''پیام مشرق'' سے جس نے سوز دروں کا ہم کو پتا بتایا
وہ ''ارمغان حجاز''، جس کا پیام بن کر جہاں میں آئی
مجھے خبر ہے
کہ پھر ہماری ہدایتوں کے لیے اسی نے
وہ ''بال جبریل'' کا نشان عظیم بخشا
مجھے خبر ہے
کہ روحِ غالبؔ بھٹک رہی تھی خلا کی بے پایاں وسعتوں میں
زمیں پہ اتری
تو اُس نے اقبالؔ نام پایا [۱]

---

[۱] بیاد شاعر مشرق: ص ۱۸۸

طاہر تونسوی کی اس طویل آزاد نظم کے مقابلے میں عظیم قریشی (پ ۱۹۱۱ء) کی نظم انتہائی مختصر مگر جامع ہے۔ قریشی صاحب نے چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں ایک بڑا خیال پیش کیا ہے: ؎

ساحل ٹوٹے
موجیں بکھریں
محمل لرزے
صبحیں نکھریں
ایک ہیولیٰ
ہر سو پرّاں
کبھی وہ انساں
کبھی وہ یزداں [۱]

آزاد نظموں میں ڈاکٹر خورشید رضوی کی "۲۱ اپریل" اپنے موضوع اور اسلوب دونوں اعتبار سے منفرد نظم ہے۔ جو بظاہر موت اور اقبال کے درمیان مکالمہ ہے مگر موت بھی کس طرح اعتراف عظمت اقبال کرتی ہے، اس نکتے کو خورشید رضوی صاحب نے بڑی مہارت سے اجاگر کیا ہے۔ نظم کا آغاز دیکھیے: ؎

موت نے پہلے جھک کر
قدم اس کے چومے [۲]

موت کا قدموں کو چومنا، اقبال کی بے پایاں عظمت کا اعتراف ہے۔ ایک پہلو یہ بھی ہے کہ روح، موت کے وقت قدموں سے ہی نکلنے کا آغاز کرتی ہے۔ گویا اسے حسن التعلیل کی دلکش مثال بھی کہا جا سکتا ہے۔ آگے بیان کرتے ہیں کہ موت نے قلب بیدار، کے ساتھ چکر لیے، اور ذہن فوراً خانہ کعبہ کے سات طواف کی طرف جاتا ہے۔ اور پھر موت اس ذہن براق کی نور ہی نور دہلیز پہ آ کے ٹھٹھکی۔ پھر موت کی تجسیم دیکھیے۔

۱۔ بیاد شاعر مشرق: ص ۲۲۶

۲۔ ضیا بار: نومبر ۱۹۷۷ء، ص ۲۵۲

اجازت اگر ہو تو اس جگمگاتی مقدس امانت کو

ان تیرہ ہاتھوں سے چھولوں۔!

مرحبا! اے فرستادۂ خالق نیست و ہست و غیب و حضور

گر یہی حکم ہے تو

خدوخال خورشید پر

پردہ شب گرادے ۱؎

اقبال کے لیے ''خدوخال خورشید'' کی ترکیب دلکش استعارہ ہے۔ مگر اس اجازت کے ساتھ ہی جو تاکید ہے وہ اقبال کی موت کے بعد ان کے چہرے کی وہ ہنستی مسکراتی تصویر ہے جس کے شاہد ان کا آخری دیدار کرنے والے ہزاروں افراد تھے: ۔

مگر ہوشیار

آخری سانس کے ساتھ

جب تو مرے جسم خاکی سے نکلے

تو میرے لبوں پر لکھی مسکراہٹ کو

پامال کر کے نہ جانا ۲؎

اردو کی آزاد نظموں کے ساتھ ساتھ ہمارے سامنے ترکی کے شاعر ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان فیر یولو کی نظم "IQBAL" بھی آتی ہے۔ یہ خوبصورت نظم انگریزی زبان میں لکھی گئی۔ اور ماہِ نو، کراچی میں شائع ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالقادر اپنی نظم میں کہتے ہیں کہ ایک دن جب سورج مشرق سے طلوع ہوا تو ایک شخص کی امید بھری آواز ابھری جو پہلے کشمیر اور لاہور پہنچی پھر ادھر اُدھر پھیلتی ہوئی استنبول جا پہنچی۔ اس نے ہمیں ''اسرار خودی''، ''بال جبریل''، ''ارمغان حجاز'' جیسی کتابیں جو دانائی کے سمندروں سے بھری ہوئی ہیں عطا کیں اور مولوی روم اس کے لیے روشنی و ہدایت کا ذریعہ ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خان کہتے ہیں: ۔

He is the one who shows the truest way to the believeres

Iqbal who is the great master of combining art and thought;

what a beloved name is Iqbal in this passing world Always dear; always

free Iqbal.

He is the longing, spiritual strength and the armof faith of the east ۳؎

۱؎، ۲؎ ضیا بار: نومبر ۱۹۷۷ء، ص ۲۵۲

۳؎ ماہ نو: اپریل ۱۹۷۰ء، کراچی، ص ۶۵

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ شعرائے اردو نے پابند و آزاد ہر دو منظومات میں اقبال کی مدح وستائش کی ہے اوران نظموں میں اپنی عقیدت ومحبت کے گوہر لٹادیے ہیں۔ درحقیقت یہ اقبال کی تو خوش بختی ہے ہی کہ زمانے نے ان کے مقام ومرتبے کو پہنچا مگر دیکھا جائے تو یہ شعرائے کرام کی بھی خوش قسمتی ہے کہ خدائے مطلق نے انھیں نگاہ سخن شناس عطا کی۔

فصل دوّم:

قطعاتِ تاریخِ وفاتِ اقبال

اصطلاح میں کسی لفظ، لفظوں کے مجموعے، فقرے، عبارت، مصرعے، شعر، عبارت کے کسی ٹکڑے یا اشعار، یا شعر کے کسی جز و کی مدد سے سنہ ہجری یا عیسوی میں کسی واقع کے ظہور میں آنے کی تاریخ نکالنے کو تاریخ گوئی کہتے ہیں۔ لیکن تاریخ گویوں نے بالعموم امرِ عظیم اور واقعۂ مشہور و قدیم کی شرط کی پابندی نہیں کی بلکہ معمولی واقعات اور حالات کی تاریخیں بھی نظم ونثر دونوں میں کہی ہیں۔ غلام علی آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:

> ''اصطلاح میں تاریخ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی لفظ یا فقرہ یا عبارت، مصرع یا بیت ایسی تجویز کریں کہ اس کے مکتوبی حروف کے عددوں سے بحساب جمل سنہ اور سال کسی واقعہ، شادی یا وفات کے معلوم ہوں یا نکاح خواہ تولد فرزند یا تصنیف کتاب، خواہ لڑائی یا بادشاہ کے جلوس یا اوامر کے وقوع کا زمانہ سمجھا جائے''۔[۱]

فن تاریخ گوئی کی بنا عربی کے حروف تہجی پر رکھی گئی جو تعداد میں اٹھائیں ۲۸ ہیں اور انھیں آٹھ کلمات میں مرتب کیا گیا ہے۔ تا کہ ذہن میں محفوظ رکھا جا سکے۔ جہاں تک تاریخ گوئی کے آغاز کا تعلق ہے تو اس کی ابتدا عرب معاشرے سے ہوئی تاہم اب وہاں اس کے نمونہ جات دستیاب نہیں۔ کسریٰ منہاس یوں رقم طراز ہیں:

> ''سب سے قدیم نمونے تاریخ گوئی کے ایرانی شاعری میں ملتے ہیں اس کے بعد فارسی گویان ہند کی شاعرانہ کاوشوں میں ملتے ہیں یہاں تک کہ اردو شاعری کا دور شروع ہوتا ہے اور تاریخ گوئی کا سلسلہ فارسی شاعری کے ساتھ ساتھ اردو شاعری میں پھیل جاتا ہے''[۲]

۱۔ غلام علی آزاد بلگرامی: بحر الفصاحت (لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۲۶ء) ص ۹۹۶

۲۔ کسریٰ منہاس: فن تاریخ گوئی (لاہور، ادارہ نقوش، ۱۹۸۹ء) ص ۲۶

مغلیہ تہذیب کے فنون میں تاریخ گوئی کو جو مقام حاصل ہے، وہ محتاج تعارف نہیں۔ دیکھا جائے تو دوسری اقوام میں بھی تاریخ گوئی کا شوق پایا جاتا ہے لیکن اسلامی تہذیب میں اس کا مقام اور مرتبہ، باقی تہذیبوں سے اعلیٰ تر ہے۔ اہل عرب حساب دانی کا بڑا شوق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے قدیم ترین دور سے لے کر اب تک تاریخ گوئی فارسی اور اردو زبان میں جاری و ساری ہے۔ ہندوستان میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ ہر شعری مجموعے کے آخر میں مصنف کی کہی ہوئی تاریخیں درج ہوتی تھیں اور اسی طرح چند منتخب تاریخیں دوسرے ہم عصر حضرات کی اس شعری مجموعے کے متعلق بھی دی جاتی تھیں۔ ہندوستان کے اردو شعرا میں غالبؔ اور مومنؔ دونوں کو تاریخ گوئی میں کمال حاصل تھا۔ اور وہ نت نئے طریقوں سے تاریخ نکالتے تھے۔ ان کے یہاں یوں تو مختلف مواقع پر وہ چاہے مسرت و انبساط کے ہوں یا رنج و محن کے، تاریخ نکالنے کا رجحان دکھائی دیتا ہے۔ تاہم ان کے یہاں متعدد تاریخیں دوستوں، عزیزوں اور شاہان مغلیہ کی وفات پر بھی ملتی ہیں۔

اس پس منظر میں جب ہم علامہ اقبال کی شاعری کی طرف بہ نظر تعمق دیکھتے ہیں تو عجب ہی منظر نگاہوں میں آتا ہے کسریٰ منہاس اپنے مضمون ''اقبال اور تاریخ گوئی'' میں لکھتے ہیں:

> ''اقبال کو تاریخ گوئی سے ربط خاص تھا، یہ الگ بات ہے کہ ان کے مروجہ شعری مجموعوں میں انکی کہی ہوئی تاریخیں سرے سے موجود نہیں لیکن یہ امر حقیقت ہے کہ شاعری کے ابتدائی دور سے لے کر آخر تک علامہ اقبال تاریخ گوئی میں منہمک رہے''۔[1]

اس امر کی تائید جگن ناتھ آزاد اپنے مضمون ''اقبال کی نظم میں اصناف سخن'' میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''فن تاریخ گوئی میں انھیں جو ید طولیٰ حاصل تھا اس کی مثال اقبال کے ہم عصروں یا اقبال کے بعد آنے والے شاعروں کے یہاں بہت کم ملے گی''۔[2]

تاریخ گوئی نثری عبارت میں بھی کی جاتی ہے اور شاعری میں بھی۔ نیز قرآن پاک کی آیات مبارکہ سے بھی تاریخ نکالنے کا رواج پایا جاتا ہے۔ اقبال کے یہاں ہمیں تینوں طریقوں سے تاریخ گوئی ملتی ہے۔

اقبال نے چند تاریخیں نثری عبارت میں کہی ہیں جن سے مرنے والے کا سال وفات ظاہر ہوتا ہے۔ بعض تاریخیں عربی میں ہیں، زیادہ فارسی اور اردو میں ہیں۔ کچھ تاریخیں قطعات میں موزوں ہیں اور کچھ پر قطعہ تاریخ نہیں کہا گیا۔

۱۔ نقوش: اقبال نمبر (لاہور، ادارہ فروغ اردو، شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء) ص ۳۸۲-۳۸۳

۲۔ اقبال ریویو: (جلد ۲۵، شمارہ ۴، جنوری فروری مارچ ۱۹۸۵ء) ص ۱۰۷

علامہ اقبال کی کہی گئی سب سے پہلی تاریخ وفات ۱۸۹۷ء میں سر سید احمد خان کی وفات پر تھی یہ تاریخ دو حوالوں سے اہم ہے۔ایک تو اس لیے کہ اقبال کی زمانہ طالب علمی کی کاوش ہے دوسرے اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اس کا ترجمہ اور مفہوم سر سید احمد خان کی زندگی اور تحریک کی پوری عکاسی کرتا ہے اور ان کے کام پر بھرپور روشنی ڈالتا ہے۔تاریخ سورۃ آل عمران کی آیت سے ماخوذ ہے۔

"انی متوفیک ورافعک الی و مطھرک"[۱]

جسٹس شاہ دین ہمایوں نے ۱۹۱۸ء میں وفات پائی۔اقبال کی ان سے غیر معمولی محبت اور تعلقات تھے اور اقبال دل سے ان کی قدر ومنزلت کرتے تھے۔اقبال نے ان کی وفات پر ذیل کا قطعہ کہا:۔

در گلستان دہر ہمایوں نکتہ سنج آمد مثال شبنم و چون بوئے گل رسید

می جست عندلیب خوش آہنگ سال فوت علامہ فصیح بہر چار سوشنید[۲]

۱۳۳۶ھ

اقبال کے کہے ہوئے قطعات تاریخ وفات میں منشی محبوب عالم (۱۸۲۹ء۔۱۹۳۳ء) مدیر پیسہ اخبار لاہور کے بارے میں کہا گیا قطعہ تاریخ بہت دلکش اور خوبصورت ہے۔اس قطعے سے اقبال کے منشی صاحب سے مخلصانہ تعلقات کا اظہار بھی ہوتا ہے۔منشی محبوب عالم کی وفات ۱۳۳۴ھ میں ہوئی۔اقبال کہتے ہیں:۔

سحر گاہاں بہ گورستاں رسیدم درآں گورے پر از انوار دیدم

زہاتف سال تاریخش شنیدم معلی تربت محبوب عالم[۳]

۱۳۳۴ھ

اقبال نے اپنے والد شیخ نور محمد کی وفات پر جو قطعہ تاریخ کہا ہے اس میں اقبال نے اپنے والد کی عظمت اور اور اپنی محبت کو سمو کر رکھ دیا ہے۔اقبال کہتے ہیں:۔

پدرو مرشد اقبال ازیں عالم رفت ماہمہ رہرواں، منزل ما ملک ابد

ہاتف از حضرتِ حق خواست و تاریخ رحیل آبد آواز اثر رحمت و آغوش لحد[۴]

۱۳۴۹ھ ۱۳۴۹ھ

۱۔ صابر کلوروی (مرتب):کلیات باقیات شعر اقبال (لاہور،اقبال اکادمی ۲۰۰۴ء) ص ۲۔۵

۲۔ ایضاً ص ۵۱۷

۳۔ ایضاً ص ۵۲۳

۴۔ ایضاً ص ۵۰۲

مذکورہ بالا تاریخوں کے علاوہ بھی اقبال نے اپنی دو بیگمات، لیڈی سر شہاب الدین، بیگم میاں احمد یار خان دولتانہ، نواب وقار الملک، ظہیر دہلوی، مرزا داغ، سید میر حسن اور ای جی براؤن کے پر معنی اور زور آور قطعات کہے ہیں۔

قطعات تاریخ وفات اقبال:

علامہ اقبال نے ۱۹۳۸ء بمطابق ۱۳۵۷ھ میں وفات پائی۔ اقبال کی وفات پر جہاں شعرا نے مراثی و نوحوں کے انبار لگا دیے۔ وہیں تاریخ گو شعرا نے بھی قطعات تاریخ کی کثرت کی ''تاریخ'' رقم کر دی۔ اور آج بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کی وفات پر جتنے زیادہ بہ اعتبار تعداد اور معیار بہترین قطعات کہے گئے، اردو تو کیا دنیا کی کسی اور زبان کے شاعر کے بارے میں نہیں کہے گئے۔ بلا شبہ یہ اقبال کا بہت بڑا اعزاز ہے۔ ذیل میں ہم سب سے پہلے ان تاریخوں کا ذکر کریں گے جو آیات قرآنی اور زبان عربی میں کہی گئیں۔

(i) آیات قرآنی اور عربی میں کہی گئی تاریخیں:

گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے ممتاز ادیب و شاعر کیپٹن منظور حسن کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے اقبال کی وفات پر پندرہ تاریخیں کہیں۔ ان میں سے پانچ تاریخیں قطعات کی شکل میں اور دس تاریخیں نثر میں کہی گئی ہیں ان کی ذیل کی تاریخ اور قطعہ اقبال کی شخصیت کی خوب عکاسی کرتا ہے۔ کیپٹن منظور حسن نے یہ تاریخ صنعت ضرب کے طریق کار سے نکالی ہے۔ کہتے ہیں: [1]

مصدر فیض و معدن الطاف
شیخ اقبال آں خدا آگاہ
بست رخت سفر، بماہ صفر
از جہان جست سوئے جنت راہ
گرچہ روپوش شد ز ما لیکن
ہست زندہ بہ نزد حق واللہ
آن نمیرد کہ شد دلش زندہ
از ولائے جمال الا اللہ
سال وصلش بصد ادب گفتم ۷×۱۰۰ ۷×۱۰۰
لا یموتون اولیاء اللہ ا ۷۰۰+۶۵۷ ۷۰۰+۶۵۷
۱۳۵۷ھ ۱۳۵۷ھ

---

[1] مہک: گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ، ص ۳۱۱

زبان عربی میں ان کی کہی گئی ایک اور تاریخ ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے اسمائے الٰہی کے ذریعے تاریخ کہی ہے۔

ھو اللہ الواحد الاحد المجیب ذوالجلال والاکرام [۱]

۱۳۵۷ھ

حامد حسن قادری (۱۸۸۷۔۱۹۶۴ء) نے اقبال کی وفات پر سب سے زیادہ تاریخیں کہیں۔ انھوں نے قرآن کی زبان میں بھی اقبال کی تاریخ وفات کہی اور ان کی یہ تاریخ اقبال کی خدمات پر خدا کی طرف سے اجر عظیم کی توثیق کی کوشش ہے: ۔

ہم زروئے دارو دروحی کریم
گفت ہاتف ''عندہ اجر عظیم''[۲]

۱۳۵۷ھ

ایک اور تاریخ میں فرماتے ہیں: ۔

سال دیگر ہم ز قرآن مبین
گفت حامد ''لذۃ للشاربین''[۳]

۱۳۵۷ھ

جناب اطہر ہاپوڑی نے بھی قرآن پاک سے تاریخ نکالی ہے اور ان کی نکالی ہوئی تاریخ بھی اقبال کی شخصیت سے ہم آہنگ ہے۔

''والمتقین فی جنات والنعیم''[۴]

۱۳۵۷ھ

مشہور مزاحیہ شاعر ابوالعلا عطا چشتی المعروف بہ حاجی لق لق نے اقبال کو ان کی زندگی میں منظوم خراج تحسین پیش کیا اور ان کی وفات کے صدمے کو بھی بہت محسوس کیا۔ عربی زبان میں لکھی گئی ان کی یہ تاریخ اور قطعہ تاریخ ان کی غم کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے: ۔

مرگ اقبال صدمہ ایست بزرگ
ناوک رنج و غم دل ماسفت
فکر کر دم چو بہر تاریخش
ہاتف از عیب یغفر اللہ گفت[۵]

۱۳۵۷ھ

۱۔ مھک: ص ۳۱۱
۲۔ ایضاً ص ۳۱۵
۳۔ ایضاً ص ۳۱۵
۴۔ ایضاً ص ۳۱۷
۵۔ تاج: اقبال نمبر ۱۹۳۸ء، ص ۳۵

(ii) اردو اور فارسی میں کہے گئے قطعات تاریخ:

بعض شعرا نے اقبال ہی کے کلام سے ان کی تاریخ وفات نکالی ہے۔ ذیل میں پہلے ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(ا) کلام اقبال سے نکالی گئی تاریخیں

علامہ اقبال نے اپنی وفات سے پہلے مندرجہ ذیل رباعی پڑھی تھی:۔

؎ سرود رفتہ باز آید کہ ناید نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگار این فقیرے دگر دانائے راز آید کہ ناید[1]

حامد حسن قادری نے اسی بحر و ردیف میں مرثیہ اقبال کہا اور تاریخ وفات یوں نکالی:۔

برفت اقبال ہند و شرق واسلام
شکوہ رفتہ باز آید کہ ناید
برفت اقبال و رفت از جاں قرارے
قرار جاں نواز آید کہ ناید
برفت اقبال و ازقوم آن و شاں رفت
زشعرش ساخت حامد سال رحلت
بشان امتیاز آید کہ نا ید
برفت اقبال آن عرفان نوائے

۱۳۳۵ھ

دگر دانائے راز آید کہ ناید[2]

+۲۰۳=

۱۹۳۸ء

جمع کے ہی قاعدے سے ایک اور جگہ فارسی نظم میں بھی تاریخ کہی۔ فرماتے ہیں:۔

---

[1] کلیات اقبال فارسی :(لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۵ء اشاعت پنجم) ص ۸۹۴

[2] سب رس: جون ۱۹۳۸ء، حیدر آباد دکن، ص ۶۵

زشعرش یا فتم ہم سال ہجری

بشان امتیاز آید نہ آید

سر آمد روز آں علامۂ ہند ۷۷۴

دگر دانائے راز آید نہ آید[۱] ۵۸۳

۱۳۵۷ھ

حفیظ ہوشیار پوری نے اقبال کو اپنی ۱۶ سالہ نظموں میں خراج عقیدت پیش کیا اور تقریباً بیس کے قریب تاریخیں کہیں۔ صرف کلام اقبال سے انھوں نے تین تاریخیں نکالی ہیں۔ایک خوبصورت قطعے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:ـ

رخت بربست از جہاں اقبال ما

آن امین شوق مشتاقی نہ ماند

ما تہی پیمانہ واماندیم حیف

آن قدح بشکست و آن ساقی نماند

درمسافر گفت خود سال وفات

''صدق و اخلاص و صفا باقی نماند''[۲]

۱۳۵۷ھ

اس طرح ''بال جبریل '' کی ایک غزل کے مصرع سے یوں تاریخ نکالتے ہیں:ـ

آنکہ بگفتا در بال جبریل

اقبال از تقدیر الٰہی

من ہم بگفتم با چشم گریاں گ=۲۰

''ہر شے مسافر ہر چیز راہی''[۳] ۱۳۳۷+۲۰

۱۳۵۷ھ

مذکورہ بالا تاریخ انھوں نے صنعت تعمیہ تدخلہ کے طریق کار سے نکالی ہے جس میں انھوں نے مصرع اول کا گ، مصرع ثانی کے حروف کے اعداد میں شامل کیا ہے۔

---

۱ اردو :اقبال نمبر، انجمن ترقی اردو نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۳۸ء، ص ۱۰۔۱۱

۲ نذر اقبال: ص ۲۴۸

۳ تاج: جولائی ۳۸، جلد ۵، شمارہ ۶ لاہور، ص ۳۸

(ب) دیگر قطعات تاریخ

حامد حسن قادری نے آیات قرآنی اور کلام اقبال سے تو تاریخیں نکالی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کا بہت خوبصورت کمال کے درجے تک پہنچا ہوئی ایک قطعہ ایسا ہے، جس کے ہر مصرع سے تاریخ نکلتی ہے ان کی یہ نظم ''اردو'' ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی ڈاکٹر فرمان فتح پوری ان کی اس نظم پر تبصرہ کرتے ہیں:

''بعض ماہرین فن نے پوری پوری غزلیں، نظمیں، قصیدے اور طویل قطعات ایسے کہے ہیں جن کے ہر مصرعے یا ہر شعر سے مطلوبہ تاریخ نکالی ہے۔ ظاہر ہے کہ عموماً اس قسم کی تاریخ گوئی میں ریاضت ہی ریاضت ہے اور شعریت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ پھر بھی بہت سی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں جن میں تاریخ گوئی کے ساتھ کمال شاعرانہ کا بھی اعتراف کرنا پڑتا ہے جیسے مولانا حامد حسن قادری کا درج ذیل فارسی قطعہ جو علامہ کی وفات پر کہا گیا'' [۱]

مذکورہ بالا قطعہ اپنی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

رفعت درجت

۱۳۵۷ھ

ترجمان حقیقت فیلسوف عصر

۱۹۳۸ء

سحر بیان آگاہ دل ڈاکٹر سر محمد اقبال رحمتہ اللہ علیہ

۱۹۳۸ء

در نظر عقیدت

۱۹۳۸ء

کمترین افقر حامد حسن قادری عفی اللہ عنہ

۱۹۳۸ء

---

[۱] فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت (لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء) ص ۲۵

رفت اقبال، آفتاب جہاں رفت اقبال وقتؔ بدر آیات

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

رفت اقبال وہم گل افشانی رفت اقبال و رفت زیب حیات

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

فخر اسلام و ناز عالم علم ناز مشرق بہترین صفات

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

ترجمان حقیقتے، بے باک حق پژدہ و فقیر خوش اوقات

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

آن قلندر صفت سخن پیرائے آں مثال حکیم وقف نکات

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

نام اقبال روشن و شیریں ذاتِ اقبالؔ مجمع الحسنات

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

تربتِ پاک محفل قدسی روح پر نورو مہبط برکات

۱۳۵۷ھ ۱۹۳۸ء

قطعہء گفتہ ام کہ ہر مصراع

مشعرے می شود بہ سال و ذات[1]

قطعات تاریخ میں ڈاکٹر سید عابدؔ حسین کے قطعہ تاریخ کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس قطعے میں عابدؔ حسین صاحب نے ذاتی غم سے زیادہ اجتماعی غم کا اظہار کیا ہے۔ اور اسلوب بیان میں بھی اقبال سے ان کی اثر پذیری جھلکتی ہے۔ کہتے ہیں:

لطفِ مجلس کیا رہا جب میرِ مجلس اٹھ گیا

وائے ناکامی کہ بزم اہلِ دل برہم ہے آج

تھا جہاں کل نغمۂ مستانہ کا جوش و خروش

ہے وہاں آہِ مسلسل نالۂ پیہم ہے آج

---

[1] اُردو: ۱۹۳۸ء ص ا۔ب

سینۂ مسلم کہ تھا گنجینۂ شوق و امید
ہے وفورِ یاس اس میں اور ہجومِ غم ہے آج
فکر کی جب سال رحلت کی تو دل نے دی صدا
ملت اسلام میں اقبال کا ماتم ہے آج[۱]

۱۳۵۷ء

ہجری تاریخ کے ہی اعتبار سے سید ہاشمی فریدآبادی (۱۸۹۰۔۱۹۶۴ء) نے اپنے قطعہ بعنوان ''تاریخ وفات''، میں اقبال کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔وہ اقبال کی ملت کے لیے خدمات کو سراہتے ہیں اور اقبال کے بعد اپنی شاعری کو ''نالہ وشیون'' قرار دیتے ہیں۔کہتے ہیں:ـ

وفات حضرت اقبال، ہاشمی ہے ہے
جگر میں قوم کے ناسور غم رہے گا یہ سال[۲]

۱۳۵۷ء

خواجہ دل محمد (۱۸۸۴۔۱۹۶۱ء) نے ایک ہی قطعے میں عیسوی اور ہجری دونوں سالوں کے اعتبار سے تاریخیں کہی ہیں۔ قطعے کا مجموعی تاثر انتہائی حزن وملال کا ہے۔کہتے ہیں:ـ

کون لائے گا اب پیام سروش
اے دل اقبال ہو گیا خاموش
شمع خاموش سال ہجری ہے

۱۳۵۷ھ

عیسوی شمع شاعری خاموش[۳]

۱۹۳۸ء

اقبال کے ہم عصر شعرا میں سے منشی محمد دین فوق اور مولانا محمد احسن مارہروی کی کہی گئی تاریخ وفات بھی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔فوق نے اقبال کی وفات پر مرثیہ بھی کہا۔اپنے اس قطعہ تاریخ میں انہوں نے ہندوستان میں اقبال کے مقام ومرتبہ کے حوالے سے نہایات بلیغ پیرایہ میں تاریخ کہی ہے۔فرماتے ہیں:ـ

۱۔ جوہر:شمارہ خصوصی بیادگار،نئی دہلی،مکتبہ جامعہ،نومبر ۱۹۳۸،صفحہ نمبر ندارد

۲۔ اردو:اقبال نمبر ۱۹۳۸ء،ص ۴

۳۔ تاج:لاہور ۱۹۳۸ء،ص ۳۷

قوم سے جاتا رہا وہ قوم کا اقبال بھی

فطرت حق کا جسے کچھ راز داں سمجھا تھا میں

یا اسے سمجھا تھا میں پیغمبر دین خودی

۱۹۳۸ء

یا چراغ محفل ہندوستاں سمجھا تھا میں[1]

۱۹۳۸ء

مولانا محمد احسن مارہروی نے ایک مصرعے میں دریا کو کوزے میں سمیٹ دیا ہے:

ہے زوالِ علم و حکمت مرگ سر اقبال بھی[2]

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال دنیائے شعروادب کی واحد ایسی شخصیت ہیں جن کی سب سے زیادہ تاریخ وفات کہی گئیں۔ یہ تاریخیں نہ صرف تعداد ہی میں وقیع ہیں بلکہ اقبال کی شخصیت، شاعری اور امت مسلمہ کے لیے ان کی خدمات اور دین اسلام سے ان کی محبت کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

---

[1] نذر اقبال: ص ۲۵۵

[2] ایضاً ص ۲۵۷

فصل سوم:

قطعات ورباعیات

قطعہ (عربی ق ط ع۔ بالکسر اول وفتح سوم) کے لغوی معنی کسی چیز کے ٹکڑے حصے یا جزو کے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں قطعہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جو دو یا دو سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہو۔ مطلع کی موجودگی ضروری نہیں مگر ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں قافیے کی پابندی لازم ہے۔ کچھ محققین قطعے کو قصیدے کا ٹکڑا قرار دیتے ہیں اور بعض غزل کے ساتھ شامل کرتے ہیں جیسے صاحب فرہنگ آنندراج کا خیال ہے:

''پارہ از غزل یا قصیدہ بریدہ شدہ است''[۱]

لیکن یہ خیال درست نہیں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ قطعہ، قصیدے اور غزل ہر دو اصناف سے علیحدہ علیحدہ وجود میں آیا ہے اور قصیدے سے الگ ہونے والے قطعات اور غزل سے وجود میں آنے والے قطعات میں کافی زمانی بعد پایا جاتا ہے''۔[۲]

قطعہ کا پہلا شعر بالعموم مطلع نہیں ہوتا۔ مگر اساتذہ کے یہاں ایسے قطعات مل جاتے ہیں جن میں مطلع موجود ہے۔ البتہ قطعات میں ردیف کا استعمال شاذ ہے۔ قطعے کے اشعار کی تعداد متنازعہ ہے تاہم قطعے کے اشعار دو سے کم نہیں ہوتے اور زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے قطعے کے اشعار بے ربط نہیں ہوتے۔ ان میں غزل کی سی ریزہ خیالی نہیں ہوتی۔ قطعے میں مرکزی خیال اہم ہے۔ اس مرکزی خیال کے ارد گرد تمام اشعار کہے جاتے ہیں۔ اور اس کی وضاحت تمام اشعار کا مقصد ہوتا ہے۔

بہترین قطعہ وہ ہے جس کا ایک شعر پڑھ کر ہم رک نہ جائیں بلکہ فوراً اگلے اشعار کی طرف متوجہ ہوں۔ حتی کہ تمام قطعے کو ختم کر کے ہی دم لیں۔ یہ اس صورت میں ممکن ہے جب خیلاات کی کڑیاں واضح ہوں۔ بیان نہ صرف صاف اور رواں ہو۔ بلکہ شگفتہ اور برجستہ بھی ہو۔ جدید دور میں قطعات کا ایک نیا تجربہ بھی ہوا ہے جس کا مقصد قطعہ کو رباعی کے قریب لانا بلکہ رباعی کی جگہ دلانا ہے۔

قطعہ عربی سے فارسی اور فارسی سے اردو میں منتقل ہوا۔ اردو قطعات کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ فرہنگ آنند راج: ص۳۲۵۹

۲۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر: اردو میں قطعہ نگاری (لاہور، ضیائے ادب، س ـ ن) ص۲

(i) دکنی قطعات

(ii) شمالی ہند کے قطعات حاتم سے داغ وامیر تک

(iii) جدید قطعات حالی سے تا حال

موضوعات کے حوالے سے دیکھا جائے تو تصوف، بے ثباتی دنیا، اخلاقیات، اسلامی تاریخ، طنز ومزاح اور سیاست تقریباً سبھی موضوعات پر قطعات کہے جاتے رہے۔ دورِ قدیم کی نسبت دورِ جدید میں قطعہ نگاری زیادہ مقبول صنف رہی اور اردو میں حالیؔ، شبلیؔ، اکبرؔ، اقبالؔ، ظفرؔ علی خان، جوشؔ، احسانؔ دانش، احمؔد ندیم قاسمی اور جاں نثار اختؔر وغیرہ ایسے معروف نام ہیں جنھوں نے اردو قطعے کو رباعی سے زیادہ آگے پہنچا دیا۔

الف) اقبال کی قطعہ نگاری:

اقبال کی قطعہ نگاری کا جائزہ لینے کے لیے اسے ادوار میں تقسیم کرنا ہوگا۔ بانگ درا کے قطعات بلحاظ موضوع دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک وہ جو ''ظریفانہ'' کے عنوان سے ''بانگ درا'' کے آخر میں درج کیے گئے ہیں۔ دوسرے کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ ظریفانہ کے عنوان سے لکھے گئے قطعات میں اقبالؔ کو اگرچہ وہ کامیابی تو حاصل نہ ہوئی جو اکبؔر کے ساتھ مخصوص ہے تاہم بعض جگہ ان کے قطعات پر اکبؔر کا گمان ہوتا ہے۔ ''بانگ درا'' کے دوسرے قطعات کے موضوع بھی مختلف ہیں۔ تاریخی قطعات میں ''خوشحال خان خٹک'' کی وصیت، ''قید خانہ میں معتمد کی فریاد''، اور ''دریوزہ خلافت'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں اقبال کہتے ہیں:۔

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے — تو احکام حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا — خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے — مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشائی

''مرا از شکستن چنان عار ناید
کہ از دیگر ان خواستن مومیائی''[ا]

''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' میں اقبال نے سیاسی قطعات پر خاص توجہ کی ہے ان میں وہ سیاست کے مختلف نظریات پر ایک فلسفی کی حیثیت میں غور وفکر کرتے ہیں۔ ''دین وسیاست'' ''فلسفہ ومذہب''، ایسے ہی قطعات ہیں۔ سیاسی قطعات کے بعد تعداد کے لحاظ سے اخلاقی قطعات کا نمبر آتا ہے ان میں اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کی تبلیغ کی ہے۔

ا کلیات اقبال اردو :ص۲۵۴

ب) اقبال کی مدح وستایش میں کہے گئے قطعات:

اقبال کی مدح میں کہے گئے قطعات میں اولیت کا سہرا عبداللہ عمادی (۱۸۷۷ء۔۱۹۴۷) اور حامد حسن قادری (۱۸۸۰۔۱۹۶۴) کے سر بندھتا ہے۔ مولانا عمادی نے اقبال کے اپنے متعلق کسر نفسی اختیار کرنے پر جو تاریخی قطعہ کہا، اسے اقبال کی عظمت کا بلا مبالغہ اعتراف قرار دیا جاسکتا ہے۔ عمادی کہتے ہیں:

تجھ پہ اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں
اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحور تہذیب فرنگ
تجھ میں سے کچھ ہے اگر اسلام اور اقبال ہے[۱]

حامد حسن قادری کے کہے گئے قطعے بعنوان، "میر غالب اور اقبال" کو فنی اعتبار سے عمادی کے قطع پر برتری حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے عمادی کے قطعے کے مقابلے میں قادری صاحب کے ہر مصرعے میں خیال کی رو پہلے سے تیز تر ہوتی دکھائی دیتی ہے اور آخر میں وہ نسبتاً زیادہ بہتر انداز میں اپنے مدعا کو بیان کرتے ہیں:

تین شاعر مختلف اوقات میں پیدا ہوئے
جن کے فیض طبع نے اردو کو گنج زر دیا
اک اثر میں بڑھ گیا اک رفعت تخیل میں
تیسرے کی ذات میں دونوں کو حق نے بھر دیا
کائنات شاعری میں ہیں یہی دونوں کمال
تیسرے میں اس لیے دونوں کو یک جا کر دیا[۲]

اقبال کی وفات کے بعد جو قطعات لکھے گئے۔ تعداد کے اعتبار سے ان کا شمار کیا جانا بھی مشکل ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں غم رحلت اقبال کا موضوع بھی ہے اور عظمت اقبال بھی۔

ذیل میں ہم صرف ان قطعات پر بحث کریں گے جن پر باضابطہ طور پر قطعات کا عنوان ہے اور قطعہ نما نظموں سے صرف نظر کریں گے۔ ایسی منظومات کو فصل اول میں جگہ دی گئی ہے۔

اقبال کی شاعرانہ عظمت نے اقبال کے ہم عصر اور مابعد کے شعرا کے دلوں پر اپنی دھاک بٹھا رکھی ہے۔ اصغر سلیم کہتے ہیں:

۱۔ اقبال معاصرین کی نظر میں: ص ۳۵۸

۲۔ یادِ اقبال: مرتبہ خالد شفیق، ص ۲۴

اس کی نوا سے آج بھی دامن دل ہے چاک چاک
قبلۂ اہل درد وہ مردِ جنوں پسند ہے
اس کی غزل سے آج بھی صحنِ چمن میں دیکھنا
موج صبا ہے تیز تر، شعلۂ گل بلند ہے [۱]

شوقؔ بدایونی اقبال کو الفاظ و معانی کا خداوند کہتے ہیں اور وہ اپنی رائے میں حق بجانب ہیں۔ الفاظ و معانی کا جو کامل شعور ہمیں اقبال کے یہاں ملتا ہے، اردو کے اور کسی شاعر کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی کہتے ہیں:۔

الفاظ و معانی کا خداوند ہے اقبال
اور مذہب اسلام کا فرزند ہے اقبال
ہر شعر ہے ملت کے لیے زیست کا پیغام
ہر طرح سے اسلاف کا پابند ہے اقبال [۲]

اقبالؔ کی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے سمیع جمالؔ کا خوبصورت قطعہ ملاحظہ ہو:۔

علم و حکمت کی کان تھا اقبال
شاعری کا جہان تھا اقبال
اس کے شعروں میں ہے جلال و جمال
بتکدے میں اذان تھا اقبال [۳]

اور اقبالؔ کی شاعرانہ عظمت کس طرح اپنے چاہنے والوں کے قلم پر اثر انداز ہوتی ہے اور ان کے فکر و خیال کس طرح اس کے نور سے جگمگا اٹھتے ہیں۔ جگن ناتھ آزادؔ کی زبانی سنیئے:۔

---

۱ بیاد شاعر مشرق :ص۴۸
۲ ایضاً ص۱۶۹
۳ ماہ نو:نومبر۲۰۰۲ء،ص۴۰

مرے قلم نے تری یاد میں کھلائے وہ پھول
کہ گلستان کے نظارے بھی رشک کرتے ہیں
مجھے وہ اوج ملا ہے ترے سخن کے طفیل
کہ جس پہ چاند ستارے بھی رشک کرتے ہیں[۱]

محبانِ اقبالؔ کا کہنا ہے کہ اقبالؔ کا کلام کوئی عام شاعری نہیں بلکہ ان کا صریرِ خامہ، نوائے سروش ہے۔ اور اس کا سبب اقبالؔ کا وہ سچا عشق اور لگن ہے جو اقبالؔ کو اپنے مقصد سے تھی۔ راجہ محمد عبداللہ نیاز (۱۹۸۵ء۔۱۹۷۱ء) کہتے ہیں:

عشق صادق بخش دیتا ہے مقام
گفتہ انساں کو بھی الہام کا
حضرت اقبال کے ہر شعر میں
رنگ ہے جبریل کے پیغام کا[۲]

اقبال کی وفات کے بعد جو قطعات تاریخ لکھے گئے، ان میں حزن وملال کا احساس، عام قطعات کی نسبت زیادہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ بعد کے قطعات میں یہ غم محرومی کے احساس میں ڈھل جاتا ہے۔ مثلاً ہندو شاعر نرسنگھ راج عالیؔ اقبال سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

کیا موت نے ڈھونڈا ہے بہانہ اقبال
کیونکہ تجھے بھولے گا زمانہ اقبال
عالی کو تو رہ رہ کے خیال آتا ہے
اب کون سنائے گا ترانہ اقبال[۳]

شوقؔ بدایونی بھی کم وبیش انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

سرخی خون سے لکھی سرخی
رنگ پھر بھر دیا فسانے میں
جیسے تم ہو مثال خود اپنی
ایسا پائیں کہاں زمانے میں[۴]

۱۔ ماہ نو: نومبر ۲۰۰۲ء، ص ۴۲

۲۔ برگ گل: گورنمنٹ کالج سمندری، فیصل آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۳۲۲

۳۔ نذر اقبال: ص ۲۷

۴۔ بیاد شاعر مشرق: ص ۱۶۹

اس کے باوجود محبانِ اقبال خوش ہیں کہ ابھی بھی بزمِ دنیا میں اقبال کی گرمئی گفتار سے رونق ہے۔ وہ نظر سے ضرور پنہاں ہے لیکن دل اس کی برقِ تجلی سے فروزاں ہیں۔ پروفیسر خلوتؔ (پ ۱۸۹۶ء) کہتے ہیں:۔

ابھی چشمِ تصور میں ہے تیری بزم آرائی
ابھی رونق ہے قائم گرمئی گفتار سے تیری
نظر سے ہے نہاں لیکن تری آواز آتی ہے
ابھی روشن ہیں دل برقِ تجلی بار سے تیری[۱]

مختصراً یہ کہ اقبال نے اپنے پیچھے رہتی دنیا تک اپنے چاہنے والوں کا ایک ایسا سلسلہ چھوڑا ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ جمیلؔ ملک کے خوبصورت قطعات دیکھیے:۔

تو آج ہم میں نہیں ہے مگر مفکرِ زیست
ترا خلوص ترا سوز مر نہیں سکتا
ہزار بادِ مخالف چلے مگر کوئی
تری پکار کو مغلوب کر نہیں سکتا

یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا تابہ ابد
نیا جہان نئے اقبال لے کے آئے گا
دراز کار جہاں ہے طویل راہ عمل
شعور چاند ستاروں کی تھاہ پائے گا[۲]

ج) رباعیات میں ذکرِ اقبال:

رباعی عربی کے لفظ ''ربع'' سے بنا ہے۔ اس کے معنی چار کے ہیں۔ اصطلاحاً یہ چار مصرعوں والی نظم ہوتی ہے۔ ان چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون باندھنا پڑتا ہے۔ رباعی کا ابتدائی نام ترانہ تھا پھر اسے دوبیتی بھی کہا جاتا رہا۔ رباعی فکر و خیال اور اور موضوع کے اعتبار سے مکمل ہوتی ہے۔ اس کے لیے بحر مخصوص ہے اور وہ ہے ہزج مثمن (اخرب یا اخرم)۔ اس کے لیے چوبیس اوزان مقرر ہیں۔ رباعی کے پہلے دوسرے اور چوتھے مصرعے میں قافیہ لانا ضروری ہے۔ رباعی کا کینوس بہت وسیع ہے۔

---

۱ یاد اقبال: ص ۳۵
۲ مصباح الحق صدیقی، تسنیم کوثر گیلانی (مرتبین): بحضور اقبال (م۔ن، س۔ن) ص ۴۵

حمد، نعت، منقبت، بے ثباتی دنیا، سیاست، معاشرت، فلسفہ وحکمت، پند ونصائح، تصوف و مذہب اور موت و زندگی غرض دنیا جہاں کے موضوعات رباعی کے سانچے میں ڈھالے جاسکتے ہیں۔ رباعی کا خمیر ایران سے اٹھا پھر فارسی کی بدولت اردو میں داخل ہوئی۔ فارسی کے رباعی گو شعرا صرف و محض رباعیات ہی کے لکھنے کی وجہ سے معروف ہیں۔ ان میں بابا طاہر عریاںؔ، عمر خیامؔ، ابوسعید ابوالخیرؔ، عطارؔ اور سعدیؔ وغیرہ نمایاں رباعی گو ہیں۔

اردو شاعری کی دوسری اصناف کی طرح اردو رباعی کے ابتدائی نقوش بھی دکن میں ملتے ہیں مگر اس کا باقاعدہ آغاز میرؔ وسوداؔ کے دور میں ہوا ہے۔ لکھنوی شعرا میں آتشؔ، ناسخؔ، انشاؔ و جراتؔ نے رباعی کے میدان میں طبع آزمائی کی۔ مرثیہ گو شعرا میں انیسؔ و دبیر نے سیکڑوں رباعیاں لکھ کر داد وتحسین پائی۔ دبستان دلی میں ذوقؔ، غالبؔ اور مومنؔ نے بھی رباعی کے تاروں کو ہلایا۔ بیسویں صدی میں حالیؔ و اکبر کے یہاں معیاری رباعیات ملتی ہیں۔ امیر مینائیؔ، شادؔ عظیم آبادی، اقبالؔ، فانیؔ، یگانہؔ، جوشؔ اور فراقؔ جیسے شعرا نے رباعی کے گلشن کو رنگا رنگ پھولوں سے بھر دیا۔

اقبال کی وفات کے بعد سے اب تک ہمارے سامنے رباعیات کا ایک وقیع سرمایہ ہے۔ جہاں تک ان رباعیات کے موضوع کا تعلق ہے تو ان کی اکثریت وفات اقبال کے بعد کی ہے۔ اس لیے موضوع میں غم رحلت اقبال نمایاں ہے۔ دور جدید یعنی زمانہ حال میں چونکہ رباعی زیادہ معروف صنف نہیں رہی۔ اس لیے ہمیں رباعیات بھی بہت شاذ نظر آتی ہیں۔ بہرحال اقبال کے حوالے سے سب سے پہلے ہمارے سامنے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے کریسنٹ میں شائع ہونے والی خواجہ دل محمد (۱۸۸۴ء۔۱۹۶۱ء) کی رباعیات آتی ہیں۔ اقبال کا مصرع ''چو مرگ آید تبسم برلب اوست'' اقبال کے آخری لحات میں عملی تفسیر کے طور پر سامنے آیا۔ اسی موضوع کو بیان کرتے ہیں کہ اقبال زندگی میں بھی سرزمین حجاز سے بے پناہ محبت کرتے رہے اور مرتے دم بھی ان کا منہ اسی طرف تھا کہتے ہیں:۔

اقبال سر آشفتۂ گیسوئے حجاز
اقبال شہیدِ تیغِ ابروئے حجاز
مرقد میں بھی انتظار باقی ہے اسے
ہونٹوں پہ تبسم اور منہ سوئے حجاز[1]

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا کہ اقبالؔ کی شاعری کو اکثر شعرا نے نوائے سروش کہا ہے۔ خواجہ صاحب بھی اقبالؔ کا روحانی سلسلہ جبریل کے ساتھ جوڑتے ہوئے کہتے ہیں:۔

---

[1] حضور شاعر مشرق: ص ۴۷

پیغام پہ پیغام چلے آتے تھے
انعام پہ انعام چلے آتے تھے
بے تار کا سلسلہ تھا جبریل کے ساتھ
الہام پہ الہام چلے آتے تھے[1]

تلوک چند محرومؔ بھی کم و بیش انہی خیالات کا اظہار رباعی میں کرتے ہیں۔ اقبال کو مخاطب کرتے ہیں کہ اے اقبال تجھے حکیم ہند، یا لعل گلیم ہند، کہنا تری عظمت کے منافی ہے۔ تو چونکہ خدا سے ہم سخن ہوا۔ اس لئے جس طرح موسیٰ کو کلیم طور کہا جانا برحق ہے، تجھے کلیمِ ہند کہا جائے یہی تجھے زیبا ہے۔ ایک ہندو شاعر کی زبان سے اقبالؔ کی مدح میں ایسی رباعی کی نظیر ملنا ناممکن ہے۔ محرومؔ کہتے ہیں:۔

کم تر ہے، حکیم ہند اگر تجھ کو کہوں
یا لعل گلیم ہند اگر تجھ کو کہوں
اللہ سے ہم سخن ہوا تو اکثر
زیبا ہے کلیم ہند اگر تجھ کو کہوں[2]

اسی طرح ایک اور ہندو شاعر راگھویندر راؤ جذب کی رباعی شہاب ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی جس میں وہ اقبال کی وفات پر تمام ہندوستانیوں کے غم کی ترجمانی کرتے ہیں:۔

اقبال اٹھا، فنا کی منزل سے اٹھا
علم و ادب و کفر کی محفل سے اٹھا
اٹھنا تو تھا ایک دن، نہ اٹھنا تھا ابھی
اٹھا تو دھواں ہر ایک کے دل سے اٹھا[3]

اقبال سے عوام و خواص کی محبت اس درجہ تھی کہ اقبال کی وفات کے غم کو ہر چھوٹے بڑے نے اس طرح محسوس کیا گویا وہ ان کا ذاتی غم ہو۔ اور ان کا کوئی بہت پیارا عزیز یا رشتہ دار اس دنیا سے رخصت ہوا ہو۔ نشترؔ جالندھری (۱۸۹۳ء۔۱۹۷۵ء) کی رباعیات میں مرثیے کا رنگ ملاحظہ ہو:۔

۱۔ حضور شاعر مشرق: ص۴۷

۲۔ بحضور اقبال: ص۱۲۱

۳۔ نذر اقبال: ص۱۹۳

دنیا سے اٹھا راج دلارا اقبال
نظروں سے چھپا راج دلارا اقبال
ہر لحظہ ہے یوں نوحہ سرا مادر ہند
پیارا اقبال، ہائے پیارا اقبال[۱]

اسرار خودی کے کون سمجھائے گا
خود تڑپے گا کون، کون تڑپائے گا
اسلام اسی غم میں گھلا جاتا ہے
دانائے رموز عشق کون آئے گا[۲]

رعناؔ اکبر آبادی کی رباعیات میں بھی غم رحلتِ کے ساتھ اقبال کی عظمت کا اعتراف بھی دکھائی دیتا ہے۔ کہتے ہیں: ؎

ہر لفظ کمال عشق پر دال ہوا
ہر شعر لطیف حسن تمثال ہوا
اس دور میں سربلند نکلا سب سے
اقبال بڑا صاحب اقبال ہوا[۳]

راجا محمد عبداللہ نیاز (۱۸۹۵۔۱۹۷۱ء) ۱۹۴۸ء میں ملتان چھاؤنی میں منعقد ہونے والے یوم اقبال کی روداد بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ چودھویں کی رات کی مناسبت سے انھوں نے اقبال کو یوں سراہا: ؎

؎یہ رات کہ تصویر درخشانی ہے
سمجھو شب مہ اس کو تو نادانی ہے
درپردہ یہ ہے پر تو یوم اقبال
دن ایک طرف رات بھی نورانی ہے[۴]

۱۔ نذر اقبال: ص۱۹۳
۲۔ ایضاً
۳۔ جام نو: کراچی، اقبال نمبر، جلد ۱، شمارہ ۲۱، ۱۹۷۷ء، ص۴۶
۴۔ عبداللہ نیاز، راجہ: صبح سخن (لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۳ء)، ص۲۱۹

دور جدید میں رباعی کی صنف شعرا کی کم التفاتی کا شکار ہے۔ تاہم ایران میں آج بھی یہ صنف مقبول ہے اور وہاں کے شعرا رباعیات میں اقبال کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ آقائی علی اصغر حکمت فرماتے ہیں: ؎

اقبال کہ آفتاب تابندہ ماست
نامش بجہان دولت پایندہ ماست
عالم ظلمات و او بود خضر زماں
آب سخنش روح فزائیندۂ ماست[1]

---

[1] ماھنامه فیض الاسلام: پنڈی، جنوری ۷۸ء، ص ۱۰۲

فصل چہارم:

تضمیناتِ شعرِ اقبال

تضمین کا شمارہ صائع لفظی میں ہوتا ہے۔ یہ فن زمانہ قدیم ہی سے شعرا کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ تضمین کا لفظ ضمن سے مشتق ہے۔ یہ ایک کثیر المعانی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ''ملانا، شامل کرنا'' کے ہیں۔[۱]

الفرایدالدریہ Arabic English Dictionary میں تضمین کے معنی درج ہیں:

"To render anyone, responsible a surety for, to include in

to insert a thing into ....."[۲]

شاعری کی اصطلاح میں جب کوئی شاعر اپنے یا کسی دوسرے شاعر کے کسی مشہور شعر یا مصرع یا مصرع کے کچھ حصے کو اپنے کلام میں داخل کرتا ہے یا کسی معروف مصرعے پر مصرع پیوند لگاتا ہے تو اسے تضمین کرنا یا گرہ لگانا کہتے ہیں۔ فن شاعری کے اعتبار سے تضمین شعری محاسن میں شمار کی جاتا ہے۔ اس فن کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ادبیات میں ہر بڑے اور قابل ذکر شاعر نے اپنے پیشرو یا معاصر شعرا کے کلام کو کہیں نہ کہیں ضرور تضمین کیا ہے۔ خصوصاً فارسی اور اردو شاعری میں تضمین نگاری کی روایت موجود رہی ہے۔ اور شعرا نے اس فن کے استعمال سے اپنے کلام میں ترفع، کمال اور وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فارسی شاعری میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں مثلاً سعدیؔ شیرازی کہتے ہیں:

چہ خوش گفت فردوسیؔ پاک زاد
کہ رحمت برآن تربت پاک باد
میازار موری کہ دانہ کش است
کہ جان دارد و جان شیریں خوش است[۳]

۱۔ سید احمد دہلوی: فرہنگ آصفیہ (لاہور، مکتبہ حسن سہیل لمیٹڈ، طبع اول ۱۹۰۸ء، جلد ۱) ص ۶۱

۲۔ الفرایدالدریہ (Arabic English Dictionary) Beirut: Catholic Press, 1964, P 42

۳۔ غلام حسین یوسفی، بکوشش: بوستان سعدی (ایران، چاپ خانہ سحاب، ۱۳۸۲ھ) ص ۸۷

فارسی شاعری کے زیر اثر اردو شعرا کے ہاں بھی اپنے معاصرین یا پیشرؤوں کے اشعار کو تضمین کرنے کی کاوشیں نظر آتی ہیں۔ یہ سلسلہ ولؔی دکنی سے شروع ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر دور کے شعرا نے اپنی شاعری میں تضمین کا فن برتا اور ایک طرف اپنی مشاقی و صناعی، وسعت مطالعہ اور خلاقانہ صلاحیتوں کے اظہار کے لیے اس فن سے کماحقہ فائدہ اٹھایا اور دوسری طرف اپنے پیشروؤں کی مہارت شعر اور عمدگی کا بھی اعتراف کیا۔ گویا تضمین کی صنف ایک لحاظ سے پیشروؤں کی شاعری کی تحسین و تعریف بھی کہلائی جاسکتی ہے۔ ذیل میں اردو شاعری سے تضمین کی چند مثالیں دیکھیے:۔

لگا ہے آبرؔو مجھ کوں ولؔی کا خوب یہ مصرع
''سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ''[۱]

نظیؔر اس لطف سے تضمین کر تو مصرع حافؔظ
''کہ بر نظم تو افشاند فلک عقد ثریارا''[۲]

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
''آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں''[۳]

الف) اقبال کی تضمین نگاری

خود اقبال کے ہاں ہمیں تضمین کی نہایت عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ اور ان میں سے بعض تضامین دیگر شعرا کے پیرایۂ بیان اور بے مثال شعری مہارت کی تحسین پر مبنی ہیں۔ مثلاً اقبالؔ، خاقانؔی شروانؔی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ان کی مشہور مثنوی ''تحفة العراقین'' کے ایک شعر کو کمال مہارت سے تضمین کرتے ہیں:۔

وہ صاحب تحفۃ العراقین
ارباب نظر کا قرۃ العین
پوچھ اس سے یہ خاکداں ہے کیا چیز
ہنگامہ این و آں ہے کیا چیز
وہ محرم عالم مکافات
اک بات میں کہہ گیا ہے سو بات
''خود بوئے چنیں جہاں تواں برد
کا ابلیس بماند و بوالبشر مرد''[۴]

۱۔ آبرؔو: دیوان آبرو (مرتبہ) ڈاکٹر محمد حسن (نئی دہلی، ترقی اردو بیورو،، ۱۹۹۰ء)، ص ۲۲۶

۲۔ نظیؔر: کلیات نظیر (مرتبہ) عبدالباری آسی (لکھنؤ، نولکشور پریس طبع یازدھم، ۱۹۵۱)، ص ۷

۳۔ غالبؔ: دیوان غالب، ص ۷۵

۴۔ کلیات اقبال اردو: علامہ اقبال ص ۸۲۔۵۸۳

شعرائے اردو نے تضمین کے لیے کوئی مخصوص صنف یا ہئیت استعمال نہیں کی۔ البتہ مقبول صنف ہونے کے باعث صنفِ غزل میں اس کا اظہار زیادہ ہوا۔ غزل کے علاوہ شعرا نے قصیدے، مثنوی اور قطعے میں بھی عمدہ تضمینیں کیں۔ اس حوالے سے اکبر و اقبال کے نام نمایاں ہیں۔ اردو شاعری میں مثلث، مربع، مخمس اور مسدس کی شکل میں بھی تضمین کی مثالیں ملتی ہیں۔ مربع شکل میں غزل کے شعر پر تضمین کے دو مصرعے لگائے جاتے ہیں۔ مخمس میں دو مصرعے اصل غزل کے ہوتے ہیں جن پر تضمین نگار تین مصرعے بہم پہنچاتا ہے۔ اور مسدس میں تضمین شدہ شعر، تضمین نگار کے پہلے چار مصرعوں کے بعد رقم کیا جاتا ہے۔ ذیل میں علامہ اقبال کے کلام کی تضمینات کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری ہندوستان بھر میں بے انتہا مقبول و محبوب تھی۔ اقبال کے اشعار اور مصاریع زبان زد عام تھے۔ ہندوستان کے مسلمان عوام ''شکوہ''، ''جواب شکوہ''، ''ساقی نامہ''، ''مسجد قرطبہ'' اور ''ذوق وشوق'' جیسی معروف نظموں کے حافظ تھے۔ ایسے میں وہ لوگ جو خود شعر گوئی کی صفت سے متصف تھے، کلامِ اقبال کہ ہمہ گیری سے بے نیاز کیسے رہ سکتے تھے؟ نتیجۃً نہ صرف اقبال کی زندگی ہی میں ان کے کلام پر تضمینات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا بلکہ یہ سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ جہاں تک پہلی تضمین کا تعلق ہے۔ اس حوالے سے ہمارے سامنے جناب ایم یوسف ایم جے دہلوی کا نام آتا ہے۔ جن کی تضمین رسالہ ''سخن سنج'' جلد اص ۱۷ پر شائع ہوئی۔ ماہنامہ ''سیارہ'' اقبال نمبر مئی ۱۹۶۳ء نے اسے دوبارہ شائع کیا اور پر تعارفی شذرہ عباداللہ فاروقی عفی عنہ کے قلم سے درج ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> ''اقبال کی ایک غزل پر جناب ایم یوسف ایم جے دہلوی کی تضمین ارسال کر رہا ہوں جو رسالہ ''سخن سنج'' جلد اص ۱۷ پر شائع ہوئی۔ یہ رسالہ مولانا عبدالحلیم شرر مرحوم کے فرزند حکیم محمد سراج الحق لکھنو (محلّہ کٹڑہ بزن بیگ خان) ہر تین ماہ بعد نکالتے رہے۔ یہ تضمین اس کے پہلے پرچے میں شائع ہوئی۔ تاریخ وسنہ مفقود ہیں[۱]

یوسف دہلوی صاحب کی یہ تضمین مخمس کی ہئیت میں ہے اس نظم میں انھوں نے اقبال کی معروف غزل ''کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں'' کو تضمین کیا ہے۔ اور غزل کے ایک شعر پر تین مصرعوں کا اضافہ کیا ہے۔ اور ہر شعر سے پہلے کے تین مصرعوں میں مذکورہ شعر کی توضیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت منتظر کی وضاحت کرتے ہوئے اسے ہمائے خجستہ پر، ''ضیائے رخ قمر'' اور ''نوائے کرشمہ گر'' کہتے ہیں۔ یہ اشعار دیکھیے:

۱۔ سیارہ: ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۴

کبھی اے ہمائے خجستہ پر ہو نمود سایۂ ناز میں　　کبھی اے ضیائے رخ قمر ہو دوچار جلوہ راز میں
کبھی اے نوائے کرشمہ گر ہو ظہور پردہ ساز میں　　کبھی اے حقیقت منتظر نظر آلباس مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں[۱]

یوسفؔ دہلوی کی اس تضمین میں ہمیں اشعار کا لفظی سرمایہ بھی فرہنگ اقبال سے ملتا جلتا دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبالؔ کے اشعار کو تضمین کرنے کی انھوں نے ایک اچھی کوشش کی ہے۔

یوں تو کلام اقبال پر انفرادی طور پر شعرا نے سیکڑوں کی تعداد میں تضمینیں کی ہیں۔ تاہم باقاعدہ طور پر پانچ ایسے مجموعے ہمارے سامنے موجود ہیں، جو صرف اور صرف تضمینات پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں سال اشاعت کے حساب سے ان کی فہرست دی جاتی ہے۔

نام کتاب	شاعر	سال اشاعت
زخمہ وساز	آغا صادق	۱۹۶۸ء
آئینہ اقبال	منشاء الرحمٰن خان منشا	س۔ن
نذر اقبال	آتش بہاولپوری	۱۹۸۱ء
تجدید شکوہ	طفیل ہوشیارپوری	۱۹۸۷ء
عکس جمیل	منظور عباس ازہر	۱۹۹۵ء

ذیل میں تضمینات کے ان مجموعہ جات کا جائزہ سال اشاعت کے اعتبار سے پیش کیا جاتا ہے۔

۱)　زخمہ وساز (۱۹۶۸ء)

آغا صادق کا یہ مجموعہ ۱۹۶۸ء میں منظر عام پر آیا۔ آپ فورٹ سنڈیمن کالج کوئٹہ کے سابق پرنسپل اور اردو کے ایسے شاعر تھے جو ہوش سنبھالنے سے لے کر مرتے دم تک اقبال کے حلقہ بگوش رہے۔ کہتے ہیں:

> ''جب سے ہوش سنبھالا ہے اقبال مست ہوں، بادہ اقبال پیتا بھی رہا ہوں، پلاتا بھی رہا ہوں۔ نہ صرف لب پر کلام اقبال ہے بلکہ روح کی گہرائیوں میں پیام اقبال پیوست ہے۔ اقبال سے شغف آج سے نہیں برسوں سے ہے''[۲]

۱　سیارہ: اقبال نمبر، مئی ۱۹۶۳ء، ص ۱۱۴

۲　آغا صادق: زخمہ و ساز (کوئٹہ، اسلامیہ الیکٹرک پریس، ۱۹۶۸ء) ص ۷

یوں تو آغا صادق نے اپنے شعری مجموعوں ''صبح صادق''، ''فکر وفن''، ''نکات حیات'' اور ''پریشان'' وغیرہ میں بھی کلام اقبال کی روح کو جذب کرنے کی کوشش کی ہے لیکن زخمہ وساز میں یہ کوشش اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔

''زخمہ وساز'' اقبال کی غزلیات ومنظومات پر تضمینوں کا مجموعہ ہے جن میں آغا صادق نے اقبال کے حیات افروز پیغام کی تشریح وتوضیح کی ہے۔ آغا صادق نے چونکہ ذہنی اعتبار سے علامہ اقبال کی توانائی فکر کو سمیٹا ہے اس لیے انھوں نے تقریباً اقبال کے تمام اہم افکار سے متعلق نظموں یا غزلوں کی تضمین کی ہے۔

''خودی'' اقبال کا بنیادی موضوع ہے خودی کے بارے میں اقبال نے جا بجا اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ضرب کلیم کی نظم ''لا الٰہ الا اللہ'' میں انھوں نے حقائق کلمہ طیبہ کی عکاسی کے ساتھ ساتھ خودی کا تذکرہ کیا ہے۔ آغا صادق نے اقبال کی اس نظم کی تضمین کی ہے۔ انداز ملاحظہ ہو:۔

خودی کی روحِ رواں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیر کماں لا اللہ الا اللہ
خودی کا حسنِ بیاں لا الٰہ الا اللہ
خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الٰہ الا اللہ [۱]

ان اشعار میں انھوں نے اقبال کے دو مصرعوں پر تین مصرعوں کا اضافہ کیا ہے اور کلام اقبال کی تشریح کی شعوری اور کامیاب کوشش کی ہے ان تضمینات کی خاص بات یہ ہے کہ تمام کی تمام مخمس کی ہئیت میں ہیں اور ہر نظم سے پہلے آغا صادق نے تعارفی شنذرہ دیا ہے۔ گویا نظم میں بھی روح کلام اقبال کو سمونے کی کوشش ہے اور نثر میں بھی اقبال کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اور ہر نظم میں تضمین شدہ شعر کا اصل حوالہ بھی دیا ہے کہ یہ کون سے مجموعے سے ماخوذ ہے۔ ہم اسے آغا صادق کی بحوالہ تضمین نگار ایک باضابطہ اور خوش سلیقہ کوشش کہہ سکتے ہیں۔ ذیل میں ان کی نظم ''من کی دنیا'' کے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں وہ اقبال کی بے مثال شخصیت کو یوں سراہتے ہیں:۔

ہے غنیمت عارفوں کو شاعر مشرق کی ذات — جس کی باتوں میں چھپے ہیں علم وحکمت کے نکات
سچ تو یہ ہے بندۂ محکوم ہے ننگِ حیات — پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من [۲]

---

[۱] زخمہ و ساز :ص۱۰

[۲] ایضاً ص۳۱

۲) آئینۂ اقبال

ڈاکٹر محمد منشاء الرحمٰن خان منشا (پ ۱۹۲۴ء) کی تضمینات کا مجموعہ ہے۔ مجموعے پر سالِ اشاعت درج نہیں تاہم بہت مختصر سے تعارف سے ان کی تاریخ پیدائش یکم مئی ۱۹۲۴ء کا پتا چلتا ہے۔ منشاء صاحب کا تعلق ناگپور سے ہے۔ مجموعے کا انتساب انھوں نے پرستاران اقبال کے نام کیا ہے۔ پیش لفظ کے طور پر اقبال کو منظوم خراج عقیدت پیش کرتے ہیں:؎

اے حکیم نکتہ سنج و شاعر شیریں بیان
زندگی کے راز تو نے کر دیے ہم پر عیاں
تو نے حرکت کو کہا روح و روان زندگی
کیا حسیں انداز میں تو نے دیا درس خودی [۱]

اس مجموعے میں اقبال کی غزلیات، قطعات اور منظومات کے اشعار و مصاریع کو کمال فنی مہارت سے تضمین کیا ہے۔ اس مجموعے میں ۳۲ غزلیات ۳ قطعات اور اقبال کی ۹ معروف نظموں کی تضمینات شامل ہیں۔ جن غزلیات کے اشعار کو ڈاکٹر منشاء الرحمٰن نے تضمین کیا ہے ان میں سے بیشتر بال جبریل سے ہیں۔ یہ تضمینات بہ اعتبار ہیئت مخمس میں ہیں۔ اسلوب و آہنگ اقبال کے کلام سے بہت مماثل ہے منشا صاحب نے اقبال کے فکر و خیال کی تحسین و مدح اور تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ اقبال کی غزل کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو:؎

لذت سر خوشی ہے اور غم کا مزہ کچھ اور ہے
کذب و ریا ہے اور شے، صدق و صفا کچھ اور ہے
حاصل جذب و مستی اہل و فا کچھ اور ہے
"جس کا عمل ہو بے غرض اس کی جزا کچھ اور ہے
حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر" [۲]

ایک رباعی کی بہت دلکش تضمین کی ہے۔ اگرچہ ان کے اشعار تضمین شدہ شعر سے آگے تو نہیں بڑھ سکے تاہم فکرِ اقبال کی معاونت کرتے دکھائی دیتے ہیں:؎

۱۔ منشاء الرحمٰن خان منشا، ڈاکٹر: آئینہ اقبال (ناگپور، س۔ن) پیش لفظ

۲۔ ایضاً ص ۴۷

جنوں کیا میرا آفاقی نہیں ہے
مری فطرت میں خلاقی نہیں ہے
یا مجھ میں سوز مشتاقی نہیں ہے
''ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے''
کوئی شے مجھ کو ملتی ہے اگر کم
مجھے آتا نہیں قسمت پہ ماتم
تنک بخشی کا تیری کچھ نہیں غم
''سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے''[1]

منشاء صاحب نے اقبال کی جن نظموں کی تضمین کی ہے ان کے عنوانات جوں کے توں برقرار رکھے ہیں۔ نیز ان کی بحر بھی اقبال ہی کی ہے۔ ان نظموں کے چند ایک عنوانات ملاحظہ ہوں۔ ''لا الہ الا اللہ''، ''فرشتوں کا گیت''، ''ذوق وشوق''، ''ساقی نامہ''، ''زمانہ''، ''جاوید کے نام''، ''فکر و عمل''، ''احساسِ زیاں''، ''غالب'' اور ''مسجد قرطبہ''۔ منشاء صاحب نے ان عنوانات کو غالباً جوں کا توں اس لیے رہنے دیا ہے کہ انھوں نے ہر نظم کے تقریباً سبھی اشعار کو تضمین کیا ہے، قطع نظر اس سے کہ وہ مختصر ہو یا طویل۔ اور اقبال کی تضمینوں میں یہ اپنی نوعیت کی واحد مثال ہے۔ اس اعتبار سے ان کی کی ہوئی تضمین شدہ نظمیں کلامِ اقبال کی تضامین میں انتہائی منفرد مقام کی حامل ہیں۔ اور ہمیں ایسی کوئی اور مثال نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر اقبال کی مثنوی ''ساقی نامہ''، ۱۹۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ منشاء صاحب نے اس کے پانچ اشعار کے علاوہ ساری مثنوی کے ایک ایک شعر کو مخمس کی شکل میں تضمین کیا ہے اور ہر شعر کی وضاحت اس مہارت سے کی ہے کہ فی الواقع تشریح وتوضیح کا حق ادا کر دیا ہے۔ علامہ اقبال کے کلام کی جتنی بھی تضمینات ہوئی ہیں ان میں منشا صاحب کی ''ساقی نامہ'' کی تضمین، تمام پر حاوی قرار دی جا سکتی ہے۔ منشا صاحب نے ۱۹۴ اشعار اقبال پر ۲۹۷ دوسو ستانوے اشعار کا اس مہارت اور مشاقی سے اضافہ کیا ہے کہ بعض مقامات پر ان کے کلام اور اقبال کے کلام کو فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مثلاً خودی کی وضاحت کرتے ہیں: ؎

---

[1] آئینہ اقبال: ص ۴۷

خودی کیا ہے سرمایۂ حسنِ ذات خودی کیا ہے اک گوہرِ با صفات
خودی کیا ہے سرچشمۂ واردات ''خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات''
''خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات''[۱]

بالکل اسی طرح ''مسجد قرطبہ''، کے صرف ایک شعر کے علاوہ انھوں نے ہر شعر پر تین مصرعوں کا اضافہ کیا ہے ایک مخمس ملاحظہ ہو:

عشق ہے کچھ اور شے آہ وفغاں کے سوا
قلب تپاں کے سوا، سوز نہاں کے سوا
عشق کا ہے کام اور صبح زماں کے سوا
''عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام''[۲]

۳) نذر اقبال از آتش بہاولپوری (۱۹۸۱ء)

سونی پت (ہریانہ) سے تعلق رکھنے والے ہندو شاعر آتش بہاولپوری کا اصل نام دیوی دیال تھا۔ نذر اقبال ۱۹۸۱ء میں منظر عام پر آئی۔ کتاب کے آغاز میں مہاویر جین، جناب جیمنی سرشار، ڈاکٹر جاوید وششٹ، جناب نوبہار صابر پٹیالہ، ضیا فتح آبادی، ماسٹر ہنس راج نانگیہ اور رئیس نیازی وغیرہ نے اس مجموعے کی پذیرائی کرتے ہوئے تاثرات کا بیان کیا ہے۔ اور جناب پروفیسر بخشی اختر امرتسری نے اس کتاب کا قطعہ تاریخ اور بسیم حیرتی نے منظوم تحسین فرمائی ہے۔ ''عرض حال'' کے عنوان سے آتش بہاولپوری لکھتے ہیں:

میں گرد رہ کوچہ اقبال ہوں آتش
یہ منصب عالی بھی ہر اک کو نہیں ملتا
یہ میری گدائی بھی ہے ہم رتبہ شاہی
مجھ ایسا سوالی بھی ہر اک کو نہیں ملتا[۳]

آتش بہاولپوری نے علامہ اقبال کے ۶۶ منتخب اشعار اور ترانہ ہندی (۹ اشعار) کل ۷۵ پچھتر اشعار کی مخمس کی ہیئت میں تضمین کی ہے ضیا فتح آبادی لکھتے ہیں:

---

۱ آئینہ اقبال: ص۱۱۵
۲ ایضاً ص۱۳۶
۳ آتش بہاولپوری: نذر اقبال (اعلیٰ پریس بلی ماراں، دہلی ۱۹۸۱ء) ص ۱

''آتش بہاولپوری نے ڈاکٹر اقبال کے ساٹھ سے اوپر مقبول و معروف اشعار کا انتخاب کر کے ان پر جو مصرعے چسپاں کیے ہیں وہ برجستہ اور برمحل ہونے کی وجہ سے اوریجنل اشعار کا حصہ لگتے ہیں۔۔ سچ تو یہ ہے کہ آتش نے اقبال کے مصرعوں پر مصرعے لگا کر تضمین کا حق پوری طرح ادا کیا ہے''۔[۱]

کیف خدنگ آشنا ہائے جگر دیا تھا کیوں
سوز دروں دیا تھا کیوں ذوقِ نظر دیا تھا کیوں
عرصۂ زیست مختصر تونے مگر دیا تھا کیوں
باغِ بہشت سے مجھے اذنِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر[۲]

''ترانۂ ہندی'' کی تضمین کرتے ہوئے آتش نے بڑی خوبصورتی سے مذہبی رواداری، قومی یک جہتی اور خیر کے مسلک جیسی آفاقی قدروں کو شعر اقبال سے پیوست کیا ہے۔ یوں بھی ''ترانۂ ہندی'' ہندوستان کے ہندوؤں میں بہت مقبول ہے۔ آتش کہتے ہیں: ؎

نفرت کی وادیوں میں ہر گز نہ پیر رکھنا
دل میں نہ امتیاز کعبہ و دیر رکھنا
ہر دین کا ہے مسلک بنیاد خیر رکھنا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی میں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا''[۳]

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آتش بہاولپوری کی نذر اقبال، تضمینات شعر اقبال کرنے کی ایک اچھی اور مثبت کوشش ہے۔

---

[۱] آتش بہاولپوری: نذر اقبال (اعلیٰ پریس بلیماراں، دہلی ۱۹۸۱ء) ص ۲۲

[۲] نذر اقبال: ص ۱۸

[۳] نذر اقبال: ص ۷۵

۴) تجدید شکوہ از طفیل ہوشیار پوری (۱۹۸۷ء)

معروف شاعر طفیل ہوشیار پوری کے اس شعری مجموعے میں ہمیں کلام اقبال کی تضمینات، قطعات و رباعیات کی شکل میں نظر آتی ہیں۔ زیر نظر مجموعہ کلام میں طفیل صاحب نے انفرادی انداز سخن اختیار کیا ہے۔ انھوں نے حضرت علامہ کے کلام کی وضاحت اور تشریح کے لیے طنزیہ اور مزاحیہ پیرایہ اختیار کیا ہے۔ انھوں نے معاشرے کے افراد کی زبانی بھرپور طنز میں حضرت علامہ سے شکوہ منظوم کیا۔ تجدید شکوہ، کوئی مسلسل نظم نہیں بلکہ علامہ کے مختلف گراں قدر مصرعوں کو سامنے رکھ کر معاشرے کا رویہ شعر کے پیکر میں ڈھال دیا ہے۔ طنز کا یہ لباس پیکر فکر پر اتنا راس آیا کہ اسے "تجدید شکوہ"، کا موزوں نام مل گیا طفیل صاحب اکبر الہ آبادی اور حالؔی کے بعد مرزا محمؔود سرحدی سے بہت متاثر تھے۔ خود لکھتے ہیں:

"تقسیم ملک کے بعد مشاعرے ہوتے رہے ان میں اکثر اوقات محمود سرحدی مرحوم مندرجہ ذیل قطعہ پڑھتے جسے بے حد پسند کیا جاتا": ؎

ہم نے اقبال کا کہا مانا   اور فاقوں کے ہاتھوں کرتے رہے
جھکنے والوں نے رفعتیں پائیں   ہم خودی کو بلند کرتے رہے

اکبر الہٰ آبادؔی، مولانا حالؔی اور حضرت علامؔہ کے طنزیہ رنگ میں شعر کہنا میرے نزدیک گستاخی کے مترادف تھا لیکن جب محمود سرحدؔی مرحوم کا قطعہ سنتا تو اپنی کم علمی علمی اور بے بضاعتی کے باوجود دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسی رنگ میں شعر کہنے کا ارادہ کر لیتا۔[۱]

طفیؔل ہوشیار پوری کے یہ قطعات طنز، ظرافت، دردمندی، حق گوئی، محبت، عقیدت اور نیاز مندی کا پرتو لئے ہوئے ہیں۔ موجودہ معاشرتی حالات کا مطالعہ کر کے جوانانِ ملت کے رویہ زندگی کو بدلنے کے لیے طفیل صاحب نے علامہ اقبال کے اردو کلام سے ایسے مصرعے تلاش کئے جو ہماری روزانہ زندگی، طرز فکر، انداز حیات اور اسلوب نظر سے تعلق رکھتے ہیں اور انھی مصرعوں کو اساس بنا کر اپنے محسوسات اور مشاہدات کو اس طرح نظم کیا کہ وہ علامہ کے افکار عالیہ کی بالواسطہ تشریح بنتے ہوئے معاشرے کی صحیح تصویر بن گئے اور اس تصویر کشی میں افراد کی روزمرہ زندگی کا رویہ کھل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ طنز کا یہ سفر انھوں نے خارج سے ذات کی طرف کیا اور علامہ کے حضور تمام محسوسات جمع متکلم کے صیغے میں نیاز مندانہ پیش کیے۔

---

[۱] طفیل ہوشیار پوری: تجدید شکوہ (لاہور، احسان اکیڈمی ۱۹۸۷ء) دیباچہ

طفیل ہوشیارپوری نے معاشرے کی بدلتی ہوئی اخلاقی قدروں کا دردمندی سے جائزہ لیا ہے۔حضرت علامہ نے قوم کو جن احوال سے باخبر کیا تھا۔طفیل صاحب نے طنزیہ انداز میں انھی احوال کی جانب خلوص سے توجہ دلائی ہے اور اقبال کے کلام سے کس کس طبیعت نے کیا کیا مفہوم اخذ کیا ہے اور اس سے کیا کیا تخلیقی و تخیلی فائدہ اٹھایا۔اس امر کی طفیل صاحب نے چابکدستی کے ساتھ تشریح فرمائی ہے۔مثلاً ذیل کی گرہ ملاحظہ ہو: ؎

حکیم ملک و ملت راز دان محفل ہستی
خودی اور بے خودی کا آخرش یہ سلسلہ کیا ہے
اگر بندہ ہو ماہر چاپلوسی اور خوشامد میں
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[۱]

حضرت علامہ کی تعلیمات کو معکوس المعنیٰ بنا کر کس کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔اس امر کو طفیل صاحب نے اپنے مخصوص زندہ دلانہ لب و لہجہ میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے: ؎

اب اہل پاک سب کے سب ہی مومن ہونے والے ہیں
لگائے گا کوئی کیا ہم گنہ گاروں پہ تعزیریں
ہمیں تدبیر کرنے کی ضرورت ہی نہیں کوئی
''نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں''[۲]

ہم حسن کے پروانے ہم عشق کے دیوانے
درکار نہیں ہم کو تعلیم خود آگاہی
جو دل میں ہمارے ہے وہ کہتے ہیں بے کھٹکے
''اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی''[۳]

---

۱ تجدید شکوہ: ص۲۶

۲ ایضاً ص۱۰۸

۳ ایضاً ص۴۵

اسی پیام پہ ہیں آج تک عمل پیرا
بڑے مزے سے گزرتے ہیں اپنے شام و سحر
لکھا تھا تو نے یہ جاوید کو کسی خط میں
''دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر''[۱]

مندرجہ بالا قطعات میں طنز اور شوخی کی ملی جلی لہر دکھائی دیتی ہے۔ درحقیقت طفیل صاحب نے اقبال کے مصرعوں کی محض پیوندکاری نہیں کی بلکہ اقبال کے کلام کی تشریح وتفسیر کا منفرد انداز اختیار کیا ہے۔

۵) عکس جمیل از منظور عباس ازہر (۱۹۹۵ء)

منظور عباس ازہر (پ ۱۹۳۷ء) جڑانوالہ (فیصل آباد) کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اقبال کی تضمینات پر مشتمل کتاب ''عکس جمیل'' میں ۵۱ نظموں کی تضمین کی ہے۔ ان تضامین کے عنوان ''لا الہ الا اللہ''، ''زمین و آسمان''، ''مسلمان کا زوال''، ''قم باذن اللہ''، ''پنجابی مسلمان''، ''شاعر''، ''امانت''، ''علم اور دین''، ''قوت اور دین''، ''فقر وملوکیت''، ''سلطانی''، ''صوفی سے''، ''افرنگ زدہ''، ''تسلیم ورضا''، ''مکہ وجنیوا'' اور ''عالم نو'' شامل ہیں۔ منظور عباس صاحب کی تضمین کا رنگ ملاحظہ ہو:

ماحول میں گو تلخی ایام بڑی ہے
تحریر رخ وقت کی ہر ایک جلی ہے
تم پڑھ نہ سکو اس کو تو یہ کم نظری ہے
''تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک''[۲]

اقبال کی نظم ''شاعر''، کی تضمین میں انھوں نے اپنے عہد کے بعض مسائل کا احاطہ بڑی خوبصورتی سے کیا ہے:

ممکن ہے سنور جائیں کبھی پھوٹے ہوئے کرم
محرومیٔ احساس پہ آجائے اسے شرم
کر چارہ کوئی ایسا کہ ہو اس کا لہو گرم
''تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے''[۳]

۱۔ تجدید شکوہ: ص ۱۲۴

۲۔ منظور عباس ازہر: عکس جمیل (لاہور، ابلاغ، ۱۹۹۵ء) ص ۳

۳۔ ایضاً ص ۴۷

جمیل اصغر لکھتے ہیں:

''اقبال کے دو مصرعوں پر تین مصرعوں کا اضافہ اس طرح کیا ہے کہ تین مصرعے بھی اصل نظم کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک نظم ''مرد مسلمان'' کی تضمین کا یہ بند میرے اس دعویٰ کی تصدیق کرتا ہے ''۔[۱]

''مرد مسلمان'' کا یہ بند ملاحظہ ہو:۔

ہے زیر نگیں اس کے ہر اک قوت طاغوت
منزل ہے سدا اس کی نہاں خانہ لاہوت
حاصل ہیں زمانے میں اسے علم کے یا قوت
''قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان''[۲]

مجموعی طور پر مخمس کی ہیت میں کی گئی یہ تضمین منظور عباس ازہر کی اقبال سے بے پایاں محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور اقبال کو ان کا خراج عقیدت بھی۔

ہم نے اب تک شعرا کے مجموعوں کا ذکر کیا ہے تاہم ان مجموعوں کے علاوہ بھی شعرا نے کلام اقبال کی تضمین کی ہے اور تضمین کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہنے والا سلسلہ ہے۔ انفرادی طور پر اردو شعرا کے یہاں ہمیں جو تضامین ملتی ہیں ان میں مخمس کی ہیئت خاصی مقبول دکھائی دیتی ہے۔ اور یہ سلسلہ قطعات و رباعیات میں قدرے کم ہے۔ مخمس میں بہت دلکش تضمینات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ خورشید انصاری فرید آبادی اقبال کی مشہور غزل پر مخمس کی ہیئت میں اس طرح تضمین کرتے ہیں:۔

یہ سنتا ہوں ملیں گی با صفا فردوس میں حوریں
رہیں گی پیشِ خدمت جا بجا فردوس میں حوریں
ترے جلوؤں سے ہوں گی کیا سوا فردوس میں حوریں
''نہ کردیں مجھ کو مجبور نوا فردوس میں حوریں
مرا سوزِ دروں پھر گرمئی محفل نہ بن جائے''[۳]

۱۔ جمیل اصغر: (اقبال کے مقلد اردو شعرا، مقالہ برائے ایم فل اقبالیات ۱۹۹۵ء) ص ۲۳۲

۲۔ عکس جمیل: ص ۷۳

۳۔ سیارہ: فروری مارچ ۱۹۷۸ء، جلد ۳۴، شمارہ ۳،۲، ص ۸۸

فقیر حسین سرورؔ نے فارسی ادب میں خمسہ کی روایت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے اور ''پنج گنج اقبال'' کے عنوان سے تضمین کی ہے۔ فرماتے ہیں: ؎

آنسو کا ہر اک قطرہ بنتا ہے شراب آخر
اور دور میں آتا ہے جام مئے ناب آخر
کھل جاتی ہے محفل میں الفت کی کتاب آخر
''افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر'' [۱]

کلام اقبال کو تضمین کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ اگر ایک طرف ہمیں کچھ تضمین ایسی بھی ملتی ہیں جہاں اقبال اور شاعر کے کلام کو فرق کرنا مشکل ہو جائے، وہیں بعض ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں جہاں اقبال اور شاعر کے مصرعوں کا فرق ایک ہی نظر میں قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً ذیل کی تضمین ملاحظہ ہو: ؎

اپنے کردار و عمل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
اپنی اس بازوئے شل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
اپنی تقدیر ازل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ ملا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم [۲]

لیکن ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جہاں تضمین نگار اپنے اسلوب و آہنگ کو اقبال سے مماثل کرنے کی شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ؎

ہے پرچم ہلال و ستارہ کی رستخیز
کنجشک اس کے دم سے ہے آمادہ ستیز
''اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز''
''ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو'' [۳]

۱۔ افکار: کراچی ۱۹۷۷ء، ص ۵۵

۲۔ ضیا بار: ۱۹۷۳ء، ص ۱۴۶

۳۔ انجم رومانی: پس انداز (لاہور، القمر انٹرپرائزز، ۲۰۰۰ء) ص ۸۰-۷

بدلا ہوا اس طرح سے انداز جہاں ہے   چھایا ہوا ہر شخص پہ غفلت کا سماں ہے
''پھیلی ہوئی نا محرمی سودوزیاں ہے''   ''تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے''
''آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو''[۱]

اسی شعر کی تضمین جگن ناتھ آزاد یوں کرتے ہیں:

یہ عالم نو ایک عجب رہ پہ رواں ہے
بے راہ روی اس کی تباہی کا نشان ہے
افزایش سامان طرب کا ہش جاں ہے
''تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے''
''آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھا دو''[۲]

تضمین نگاری کے اصول بتاتے ہوئے محترمہ بصیرہ عنبرین کہتی ہیں:

''عمدہ تضمین کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے تضمین نگار میں چند ایسی صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے جو اسے دیگر شعرا سے ممتاز کر دیں......
ایک کامیاب تضمین نگار اپنی ذہانت، خداداد تخلیقی صلاحیت، قوت متخیلہ، فکری گہرائی اور وسعت مطالعہ سے ایک عام اور روایتی مضمون کو عمدہ تضمین سے ترفع بخش دیتا ہے''[۳]

جب ہم تضمین نگاری کے اصول اور شعرائے کرام کی پر خلوص کاوشوں کو دیکھتے ہیں تو یہ نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ اقبال کے کلام کے رنگ و آہنگ کو اپنانا آسان نہیں ہے۔ شعرا نے تضمین کرتے ہوئے اگرچہ اقبال کے رنگ شعری کو اپنانے کی بھی کوشش کی ہے۔ تاہم ان کی کوششوں کا مقصد ''تضمین برائے تضمین'' سے زیادہ ''تضمین برائے تحسین'' تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم معیار سے صرف نظر کرتے ہوئے ان شعرا کی اقبال سے محبت اور خلوص کے پیش نظر اسے منظوم خراج تحسین کی اعلیٰ کوشش کہہ سکتے ہیں۔

۱۔ کشفی ملتانی: ہفت روزہ بشارت (مظفر گڑھ، ۲۰ ستمبر ۱۹۶۳ء) ص۔ن
۲۔ جگن ناتھ آزاد: بیکراں (نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند) ۱۹۹۲ء ص ۸۶
۳۔ بصیرہ عنبرین: تضمینات قبال (لاہور: فکشن ہاؤس ۲۰۰۲ء) ص ۵۳

فصل پنجم:

منظوم غنائیہ

ملتان سے تعلق رکھنے والے معروف غزل گو، محقق اور اقبال شناس اسلم انصاری نے اقبال کی مدح وتحسین کا ایک جدا انداز اپنایا ہے انھوں نے اقبال کی فکر اور سوچ کو اجاگر کرنے کے لیے منظوم عنائیہ، اور ایک تصوریہ Fantasi تحریر کیا ہے جوان کی کتاب ''فیضان اقبال'' میں شامل ہے۔

اسلم انصاری پیش لفظ میں اس مجموعے کی وجہ تخلیق بتاتے ہوے رقم طراز ہیں:

> ''اب سے کچھ عرصہ پہلے میرے کرم فرمانے ایک ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں مجھے اقبال کے نقادوں پر ایک فیچر پروگرام لکھنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اگر اسے منظوم غنائیہ بنا دیا جائے تو اس سے ان کو بہت خوشی ہوگی۔ اقبال کے فکر وفن کے بارے میں تحریر وتقریر سے مجھے جو اہتزاز وانبساط حاصل ہوتا ہے۔ اس کے پیش نظر میں نے اس پروگرام کو ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا اور مشرق ومغرب کے بعض اہم اور نمائندہ اقبال شناسوں کی بعض تحریروں کی اساس پر بیایہ مجلس اقبال کے عنوان سے ایک منظوم غنائیہ سپرد قلم کر دیا جو بیک وقت ریڈیائی تشکیل بھی بن گئی اور ایک طرح کی منظوم تمثیل بھی''[۱]

''بیایہ مجلس اقبال'' بہت دلکش اسلوب میں لکھا گیا منظوم غنائیہ ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اب تک اردو میں اقبال کے متعلق ایسی شاندار منظوم تمثیل دیکھنے میں نہیں آئی۔ اسلم انصاری نے اس تمثیل میں اقبال کے نقادوں کو کرداروں کا بہروپ دیا ہے اور اناؤنسز کو متعارف کنندہ کی حیثیت دی ہے۔

---

۱ اسلم انصاری: فیضانِ اقبال (ملتان، مجلس فکر اقبال، ۱۹۹۷ء) ص ۱

''راوی'' اور ''نوائے سروش'' دو الگ کردار ہیں جو فکر اقبال کی بعض جہتوں اور خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کرداروں کے اپنے مقام و مرتبہ کو بھی دو منظوم خراج تحسین پیش کیا گیا ہے جن تاریخی شخصیات کے مکالمے کرداروں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر یوسف حسین خان، پروفیسر آرتھر آربری، ڈاکٹر عبدالوہاب عزام اور ڈاکٹر این میری شمل شامل ہیں۔ اس غنائیہ کی ترتیب میں سب سے پہلے ارباب مجلس کے عنوان سے ان شخصیات کا مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔

غنائیہ کا آغاز دو راویوں کے باہمی منظوم ڈائیلاگ سے ہوتا ہے جس کا موضوع قحط الرجالی ہے۔ اسلم انصاری بڑے دلکش انداز میں اقبال کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں:۔

قرن تا قرن۔ فقط ایک صدا ایک نوا، ایک پکار
ہے کوئی منزل آدم کا سراغ
ہے کہیں عظمت انساں کا نشاں
ہے کہیں مے کدہ جاں میں کوئی سوز تمنا کا ایاغ[۱]

اور جواب میں راوی نمبر ا کہتا ہے:۔

جب کئی قرن، کئی عہد، کئی دور گزر جاتے ہیں
تب کہیں جا کے ملے فطرت ہستی سے اشارہ کوئی
تب کہیں جا کے ابھرتا ہے ستارہ کوئی[۲]

اناؤنسز ایک ایک کر کے ہر مقرر کا منظوم تعارف کراتا ہے۔ اور ہر مقرر اپنی گفتگو کا آغاز اقبال کی تحسین سے کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر یوسف حسین خان اقبال کی شاعری کی خوبیاں بیان کرتے ہیں:۔

وہ کہ شاعر بھی تھا اور فلسفی و عارف بھی
اس کے ہاں درد بھی ہے، سوز بھی ہے، ساز بھی ہے
شوقِ پرواز بھی ہے، جوشِ تگ و تاز بھی ہے
رندی و مستی کا مضمون بھی نصیحت بھی ہے
ہے تغزل بھی، حکایات بھی، حکمت بھی ہے
دین کی تعلیم بھی ہے، عشق کی تلقین بھی ہے[۳]

---

۱ فیضان اقبال :ص ۳

۲ ایضاً ص ۲۰

۳ ایضاً ص ۳۴

فصل ششم:

اقبال عالم مثال میں: ایک تصوریہ یا Fantasia

اس فنتازیہ یا تصوریہ میں تخیل کی سطح پر دنیائے ادب وفلسفہ کے کچھ ایسے نامور نمائندوں کو اپنی بات کہنے کی اجازت دی گئی ہے جو مثنوی اسرار خودی میں بالخصوص اقبال کی کڑی تنقید کا نشانہ بنے ہیں۔ ان میں یونان کے افلاطون، ابن عربی اور فارسی کے عظیم غزل گو خواجہ حافظ شیرازی ممتاز ونمایاں ہیں۔ اس خیالی مکالمے (Colloqiam) میں اقبال کے ان معتوبین کے علاوہ بعض دوسرے مفکرین مثلاً نیطشے اور برگساں نے اسلم انصاری کی زبان میں جس طرح ان کے شکووں کے جواب دیے ہیں ان سے ایک بار پھر اقبال کے نقطۂ نظر کی تصویب ہوتی ہے۔ اسلم انصاری لکھتے ہیں:

> ''اس فنتازیے کے ذریعے اقبال کے بعض رویوں کی تشریح کے ساتھ ساتھ بعض ممکنہ مغالطّوں کی تردید بھی مقصود ہے جو انسان اور زمانے کے بارے میں اقبال کے بعض تصورات کے پیش نظر بیدار ہو سکتے ہیں''[۱]

مجموعے کا آخری حصہ اقبال کے بعض بنیادی تصورات کی نئی شعری تشکیلات پر مشتمل ہے۔ اردو شاعری میں تغیر وارتقا کا علمبردار اقبال سے بڑھ کر کوئی نہیں اور اسلم انصاری کی رائے میں آج ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبال کے بعض بنیادی تصورات کی نئی شعری تشکیل کی جائے اسلم انصاری نے خودی، مرد کامل، شاہین، اقوام مغرب، اقوام مشرق، تعلیم، افراد اور تہذیب نو کے موضوع پر اقبال کے خیالات کی منظوم تحسین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجموعے میں شامل ''ساقی نامہ جدید'' اقبال کے ساقی نامہ کی بحر میں لکھا گیا ہے۔ انھوں نے اس ساقی نامہ میں تاریخ اور عصر حاضر کے بعض اہم فلسفیانہ افکار سے اجمالی طور پر بحث کی ہے۔ ان مباحث میں علامہ اقبال کا تصور خودی سرفہرست ہے لیکن اسے تاریخ کے جدلیاتی عمل اور عصر حاضر کی معروف فکری روش فلسفہ وجودیت کے تناظر میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ایک امتزاجی نقطۂ نظر سے تاریخ وحیات کے تناقضات سے ذہنی سطح پر عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی گئی ہے۔ انصاری صاحب کہتے ہیں:۔

---

[۱] فیضان اقبال: ص۱۲

خودی آدمی میں نمودار ہے
یہ دراصل معیار و کردار ہے
خودی ہے ارادہ ، خودی ہے شعور
مجسم ہے انساں میں اک موج نور[1]

مجموعی طور پر فیضانِ اقبال میں شامل منظوم غنائیہ، تصوریہ اور نئی شعری تشکیلات اقبال کے اعتراف عظمت اور خراج تحسین کی دلیل ہے۔

---

[1] فیضانِ اقبال : ص۸۵

فصل ہفتم:

دوہے

اقبال سے محبت کرنے والے شعرا نے شاعری کی کوئی صنف اقبال کے ذکر اور مدح و تحسین سے خالی نہیں رہنے دی۔ یہاں تک کہ ہمارے سامنے دوہے کی صنف میں بھی تاج سعید کے دلکش دوہے، موجود ہیں۔ ان دوہوں میں نغمگیت اور شیرینی اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ تاج سعید اقبال کی شاعری کو خوبصورت گیت قرار دیتے ہیں:

ایک کوی اقبال کہ جس نے گیت انوکھے گائے
گیت کہ جن کو سن کر مورکھ دھیرے سے مسکائے
اس مسکان میں چھپا ہوا تھا بھید نیا نرالا
بھید کو جان کے کوی نے بھی پھر اپنا ہوش سنبھالا
ہوش سنبھال کے کوی جی پھر اپنی فکروں میں ڈوبا
ڈوب کے ابھرا جب تو دیکھ چکا تھا سندر سپنا
آنکھ ملا کے اس نے چھیڑے اس دھرتی کے گیت
گیت کو سن کر اس کو ملے پھر من چاہے سے میت[1]

---

[1] بیاد شاعر مشرق : ص۴۷

حاصل بحث

حاصل بحث

تاریخ شاہد ہے کہ ہر قوم کی کچھ روایات ہوتی ہیں، جن سے وہ قوم روحانی اور اخلاقی توانائی حاصل کرتی ہے اور جو قوم ان روایات کو فراموش کر دیتی ہے، زمانہ بھی اسے بھلا دیتا ہے۔ عظیم تاریخی شخصیات اور دیرینہ روایات کو زندہ رکھنے کا ایک اہم وسیلہ شعر ہے۔ ادبیاتِ عالم کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ دنیا کے ہر ادب میں دلیر و شجیع، ذہین و لائق، اخلاق عالیہ سے متصف اور بے مثال افراد و سلاطین کی مدح و تحسین نظر آتی ہے۔

عربی ادب بلاشبہ عالمی ادب میں قدیم ترین ادب کہلانے کا حق دار ہے، اس کی تقریباً تمام اصناف سخن میں مدح شخصی کی روایت ملتی ہے۔ مثلاً سبع معلقات میں عمرو بن کلثوم جیسے دلیر اور غیرت مند سردار کی مدح، معتصم باللہ کی غیرت ایمانی کی تعریف، الفرزدق اور جریر کی حق گوئی کی تحسین ہمیں ان کے اسلاف کے کارناموں سے روشناس کراتی ہے۔ پھر عربی مرثیے کا مطالعہ کیا جائے تو شخصی مرثیہ نگاری میں معروف مرثیہ گو شاعرہ خنساء کے مرثیوں میں مدح و تحسین کے جذبات اور نبی ﷺ کی وفات پر عشق و مدح رسولؐ میں ڈوبے ہوئے مرثیوں کو تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ عربی نعت کو دیکھیے تو اس کے موضوع کا محور نبیؐ کی ذات مبارکہ ہے۔ اور آپؐ کی مدح میں کہی گئی نعتیں، شعرا کے انتہائی اخلاص، عقیدت اور دلی جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

فارسی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی اپنے اسلاف کے کارناموں کو زندہ رکھنے کی روش اصناف شاعری میں نظر آتی ہے۔ ایران کی سرزمین اور سلاطین کا ذکر آپس میں لازم و ملزوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی شاعری میں کم و بیش ہر بڑے شاعر کے یہاں مدح سلطان کا موضوع ملتا ہے۔ وہ رودکیؔ ہو یا فرخیؔ، عنصریؔ ہو یا معزّیؔ یا انوریؔ، خاقانیؔ اور قاآنیؔ ہوں، سبھی شعرا کے قصائد نے فارسی دنیا میں اور اپنے عہد میں ہر طرف دھوم مچا رکھی تھی۔ فارسی شاعری میں ممدوح عموماً سلاطین، نواب اور امرا ہوتے تھے۔ عربی شاعری کا ممدوح معاشرے کا ممدوح ہوتا تھا۔ دولت معیار نہ تھی کردار، صلاحیت، اخلاق، دلیری و شجاعت جیسے اوصاف کا ممدوح میں ہونا ضروری تھا۔ ایران میں صفوی بادشاہوں کے آنے کے بعد مدح کا رخ آل بیت رسولؐ کی طرف مڑ گیا۔ گویا مدح کا انداز وہی رہا، تاہم ممدوح بدل گئے۔

فرخیؔ نے محمود غزنوی کی وفات پر جو مرثیہ لکھا، اس میں محبؔ کے سوگوار احساسات کی پوری پوری تصویر موجود ہے۔

ایران میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ شعرا نے مدح شخصی ترک کر کے مدح ممدوح عالمؐ کا آغاز کیا۔ مسعود سعد سلمان، جلال الدین رومی، عراقی، امیر خسرو، خواجو کرمانی، سلمان ساوجی، جامی، فیضی اور عرفی کے ہاں بہت پر تاثیر اور دلکش نعتیہ شاعری ملتی ہے۔ مختصراً یہ کہ عربی اور فارسی شاعری میں مدح و تحسین کی یہ روایت ہی آگے چل کر اردو شاعری منظوم خراج عقیدت کی بنیاد بنتی دکھائی دیتی ہے۔

اردو شاعری کا وسیع دامن رنگارنگ اصناف سے مزین ہے اور ہر صنف سخن میں ہمیں منظوم مدح کے آثار ملتے ہیں۔ اردو کی ابتدائی شاعری میں قصائد کے موضوعات محدود ہیں۔ تاہم سودا تک پہنچتے پہنچتے تک یہ یہ صنف وسعت اختیار کر جاتی ہے اور سودا کے ۱۴۱ قصائد اور ممدوحین کی ایک وقیع تعداد ہمارے سامنے آتی ہے۔ سودا اہل بیت و بزرگان دین کی مدح بھی کرتے ہیں اور اہل دول کی تعریف بھی۔ انشاء، مومن غالب، گرامی، محسن کاکوروی سبھی کے قصائد میں ہمیں برعظیم پاک و ہند کی نامور شخصیات کی مدح و تحسین نظر آتی ہے۔

اردو شاعری کے شخصی مرثیوں میں ہمیں ایک فرد مخصوص کے محاسن اور کارناموں کی تفصیل ملتی ہے۔ بالخصوص جو مرثیے شعرا نے دوسرے شعرا کی عظمت کے اعتراف میں لکھے ہیں، وہ درد وغم اور اظہار عقیدت لیے ہوئے ہیں۔ ان مرثیوں میں خصوصیت سے ''غالب'' اور ''حکیم محمود خان'' کی وفات پر حالی کے مرثیے اور محبوبہ دلنواز، اور زین العابدین خان عارف کی وفات پر غالب کے مرثیے اور مولانا محمد علی جوہر اور علامہ اقبال کی وفات پر حفیظ جالندھری کے مرثیوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ یہ مرثیے درد وغم کے جذبات سے معمور ہیں اور اس کے ساتھ ہمیں ممدوحین کے اوصافِ عالیہ سے بھی روشناس کراتے ہیں۔

علامہ اقبال کی انقلاب آفریں شخصیت، ان کا معجز نما کلام اور ان کے عہد آفریں افکار و نظریات ہماری ملت کی متاع عزیز ہیں۔ پاکستان علامہ مرحوم کی اس فکر کا پرتو ہے جو سوز و ساز رومی اور پیچ و تاب رازی سے عبارت تھی۔ انھوں نے ایک ایسی قوم کی عروق مردہ میں حیاتِ تازہ کا لہو دوڑایا جو سیاسی طور پر مایوس اور تہذیبی طور پر شکست خوردہ تھی۔ انیسویں صدی کا آخر اور بیسویں صدا کا ابتدائی دور نہ صرف مغربی استعمار کے عروج کا دور تھا بلکہ یہ وہ زمانہ تھا جب خیالات اور افکار کے افق پر صرف مغربی مفکرین اور فلسفیوں کی سوچ کا سورج پوری تابانی کے ساتھ چمک رہا تھا اور مشرق کے باسیوں کی آنکھیں خیرہ ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں حضرت علامہ نے جو بذات خود کسی مدرسے اور خانقاہ کی پیداوار نہ تھے بلکہ مغربی طرز کے تعلیم یافتہ تھے، اسلامی تعلیمات کی برتری اور اسلامی نظریہ حیات کی عظمت کو اتنے موثر اور پرزور انداز میں پیش کیا کہ عالم اسلامی میں ان کے افکارِ تازہ سے ایک نئی زندگی پیدا ہوگئی۔ اقبال کی عظمت کا دائرہ بے حد وسیع ہے۔ وہ برعظیم کے مسلمانوں کے لیے زندہ رہے اور مرے، وہ عرب و عجم کے لیے جیے اور مرۓ وہ عالم اسلام کے لیے جیے اور دنیا سے رخصت ہوئے اور وہ مشرق و مغرب کی دنیائے انسانیت کے لیے زندہ رہے اور مرے۔

اقبال کی شخصیت کی اس عالمگیریت کی وجہ سے اقبال کو جو مقبولیت اپنی زندگی میں ملی، اس کی نظیر ادبیات کی تاریخ

میں نایاب ہے، ان کی زندگی ہی میں، شاعری کے تراجم کے ذریعے سے انگلستان، جرمنی، مصر اور ایران کے دانش ور اور ادبی حلقے ان سے واقف ہو چکے تھے۔ پھر جس فراخدلی کے ساتھ برعظیم میں ان کے ہم عصر شعرا نے ان کی زندگی میں ان کے شعری کمال کا اعتراف کیا ہے، وہ بجائے خود اقبال کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔

کہا جاتا ہے کہ شاعری کا بہترین ناقد شاعر ہوتا ہے۔ اس مقولے کو اگر اقبال کے حوالے سے دیکھا جائے تو علامہ کو پیش کیا جانے والا منظوم خراج تحسین کا سرمایہ شعرا کی طرف سے ان کی فنی عظمت کا بے مثال اعتراف ہے۔ علامہ اقبال کو ان کی زندگی میں ساٹھ ۶۰ سے زائد شعرا نے خراجِ عقیدت پیش کیا جن میں ہندو، مسلمان اور عرب شعرا تھے۔

اردو شاعری کی تاریخ میں علامہ اقبال واحد ایسے شاعر ہیں جنھوں نے سب سے زیادہ شعرا کے مرثیے اور ان کی تحسینی منظومات لکھیں اور یہ بات اس سے زیادہ خوش آئند ہے کہ اردو شعرا میں اقبال واحد ایسے شاعر ہیں جن کے بلا مبالغہ سب سے زیادہ مرثیے لکھے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں تحسینی منظومات لکھی گئیں۔

پرستاران اقبال علامہ اقبال کی زندگی کے ایک ایک لمحے سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے تھے۔ ۱۹۰۴ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک حیاتِ اقبال کے تقریباً ہر اہم موقع پر شعرا نے اقبال کو خراج تحسین پیش کیا۔ خصوصیت کے ساتھ علامہ اقبال جب بھی کہیں سفر پر گئے، شعرا نے الوداعی نظمیں لکھ کر انہیں رخصت کیا۔ اور لوٹنے پر خیر مقدمی نظموں کے ساتھ استقبال کیا اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال وہ واحد ہستی ہیں جن کی زندگی میں ان کا ''یوم'' منایا گیا اور ان کی زندگی ہی میں معروف ادبی جریدے ''نیرنگ خیال'' کا ''اقبال نمبر'' شائع کیا گیا۔ یہ تمام اعزازات اقبال کو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی ادب میں ممتاز ترین مقام عطا کرتے ہیں۔

۱۹۳۸ء برعظیم پاک و ہند کے لیے بالخصوص حزن و ملال کا سال تھا کہ زندگی کو ''کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں'' کہنے والا اقبال چل بسا۔ اہلِ دل نے جس انداز، جس شکل، جس ڈھنگ اور جس نوعیت میں ماتم کیا، اس کی جھلک ہمیں اقبال کی وفات کے بعد لکھے جانے والے مرثیوں میں نظر آتی ہے۔ غم و اندوہ کا یہ اظہار صرف مرثیوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ قصائد، قطعات، قطعاتِ تاریخ، منظومات، رباعیات، تضمینات اور دوہے غرض شاعری کی تمام اصناف میں ہمیں شعرا اقبال جیسی عظیم ہستی سے محرومی کا ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

اقبال صرف اہل اسلام اور ہندوستان کے شاعر نہ تھے بلکہ پورے عالم انسانیت کے شاعر تھے ان کے ہاں اہل وطن کے ساتھ ساتھ پوری انسانیت کے لیے ایک محبت، دل بستگی اور بنی نوع انسان کے لیے فلاح کا تصور ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اقبال کے پرستاران صرف مسلمان نہیں بلکہ پوری دنیا کے مفکرین، شاعر اور فلسفی، وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، فکر اقبال کی تحسین کے ساتھ اس سے استفادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر قوم اور مذہب کے ماننے والے آج اقبال کو ''ہمارا اقبال'' کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور اقبال کی شان میں منظوم خراج عقیدت کا یہ سلسلہ رہتی دنیا تک جاری و ساری رہے گا۔

ضمیمہ جات

ضمیمہ نمبر۱: علامہ اقبال کو ان کی زندگی میں منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے والے شعرا اور ان کی منظومات کی فہرست

ضمیمہ نمبر۲: شعرائے عصرِ جدید کا منظوم خراجِ تحسین (ایک مختصر انتخاب)

ضمیمہ نمبر ۱

علامہ اقبال کو ان کی زندگی میں منظوم خراج عقیدت پیش کرنے والے
شعرا اور ان کی منظومات کی فہرست

ضمیمہ

علامہ اقبال کو ان کی زندگی میں خراج عقیدت پیش کرنے والے شعرا اور ان کی نظموں کی فہرست

نمبر شمار	شاعر	نظم کا نام	مشمولہ
۱	ابوالعلا عطا چشتی	آرزوئے اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۲	اثر، غلام قادر		نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۳	ارشد گورگانی	ایک مصرع	نذرِ اقبال، مرتبہ حنیف شاہد
۴	احسان بن دانش	تصویرِ خیالی	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۵	احسن مارھروی	نذرِ اقبال	بیادِ شاعرِ مشرق (مرتب ناصر زیدی)
۶	اخگر جالندھری	اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۷	اسدؔ ملتانی	وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں	اقبالیات اسد ملتانی
۸	ایضاً	اقبال	ایضاً
۹	ایضاً	سوال بہ اقبال	ایضاً
۱۰	اسلم جیراجپوری	اقبال	اقبال معاصرین کی نظر میں
۱۱	اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی	مقصدِ رسالت	اقبال کے ہم نشین
۱۲	ایضاً	نذرِ اقبال	اقبال کے ہم نشین
۱۳	ایضاً	خطاب بہ اقبال	اقبال کے ہم نشین
۱۴	ایضاً	مثنوی	اقبال کے ہم نشین
۱۵	ایضاً	اقبال کی علالت پر نظم	اقبال کے ہم نشین
۱۶	اکبرالہٰ آبادی	رباعی	زمیندار ۱۹ اپریل ۱۹۱۶ء

نمبر شمار	شاعر	نظم کا نام	مشمولہ
۱۷	اکبرالہٰ آبادی	اقبال کی والدہ مرحومہ کا مرثیہ	کلیاتِ اکبر
۱۸	ایضاً	غزل	کلیاتِ اکبر
۱۹	این ایچ ہاشمی	اقبال اور اردو	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۲۰	بدرالدین قیصری	اقبال	فخرن مئی ۱۹۰۴ء
۲۱	تاثیر، محمد دین	عالمگیر	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۲۲	جلال الدین اکبر	اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۲۳	حامد حسن قادری		نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۲۴	حامد علی خان مولانا	اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۲۵	حفیظ جالندھری	تین نغمے	سوز و ساز
۲۶	حفیظ ہوشیار پوری	اللحیات اور اقبال	رجالِ اقبال
۲۷	ایضاً	نظم	نذرِ اقبال مرتب ذوالفقار احمد تابش
۲۸	دلبر حسن مسحور	اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۲۹	رسا محمد کبیر خان		نیرنگِ خیال
۳۰	سرور جہاں آبادی منشی درگا سہائے	فضائے برشگال اور پروفیسر اقبال	نذرِ اقبال از تابش
۳۱	سید بشیر احمد		نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۳۲	سید مقبول حسین رامپوری	اقبال اور ٹیگور	حضور شاعرِ مشرق
۳۳	شاہ دین ہمایوں	شالامار باغِ کشمیر	جذباتِ ہمایوں
۳۴	ایضاً	چمن کی سیر	ایضاً
۳۵	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	'اقبال	'نذرِ اقبال مرتب ذوالفقار تابش
۳۶	ظفر علی خان مولانا	محاکمہ	ایضاً
۳۷	ظفر علی خان مولانا	نذرِ اقبال	نگارستان
۳۸	عبدالحمید حمد	اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء

نمبر شمار	شاعر	نظم کا نام	مشمولہ
۳۹	عبدالرحمٰن بزمی	الی شاعر مسلمی العمند	اقبال عرب شعرا کی نظر میں
۴۰	عبدالرشید ملک	پیشکش بحضور اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۴۱	عبدالغنی حسن	الی شاعر الھند الکبیر	اقبال عرب شعرا کی نظر میں
۴۲	عبداللہ عمادی	قطعہ	نقوش شخصیات نمبر ۲
۴۳	عرشی امرتسری		نذرِ اقبال از تابش
۴۴	فیروز الدین طغرائی حکیم	حکیم طغرائی کا محاکمہ	ایضاً
۴۵	فیض احمد فیض	اقبال	طلوعِ اسلام فروری ۱۹۳۳ء
۴۶	فگار سیالکوٹی		نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۴۷	کاشی پریاگی	اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۴۸	گرامی غلام قادر		اقبال کے ہم نشین
۴۹	گرامی غلام قادر	نذرِ عقیدت	نذر اقبال از تابش
۵۰	لمعہ حیدر آبادی		معاصرین اقبال کی نظر میں
۵۱	مجازی لکھنوی	اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۵۲	مجید ملک	پیشکش بحضور اقبال	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۵۳	مخدوم محی الدین	اقبال	حضور شاعر مشرق
۵۴	مخدوم محی الدین		اقبال کے ہم نشیں
۵۵	مغموم مولانا محمد اسماعیل	ہدیۂ اقبال	نذر اقبال از تابش
۵۶	مظہر انصاری بی۔اے	اقبال سے	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۵۷	مقبول حسین رامپوری	اقبال اور ٹیگور	معارف مارچ ۱۹۳۲ء
۵۸	نادر کاکوروی	شمع مزار	اقبال کے ہم نشیں
۵۹	نیرنگ، غلام بھیک	ترانہ مسرت	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء
۶۰	یکتا محمد شرف الدین	بزم خیالی	نیرنگِ خیال ۱۹۳۲ء

ضمیمہ نمبر۲

شعرائے عصرِ جدید کا منظوم خراج تحسین

(ایک مختصر انتخاب)

ادا جعفری

نظم

پاسِ ادب سے تجھ کو سخنور نہ کہہ سکوں
تو وہ سفیرِ درد مسیحا کہوں تجھے
حسنِ نظر کہ عین نظارا کہوں تجھے
اقبال! کائناتِ تمنا کہوں تجھے
دلِ ہی نہیں جسے دلِ مضطر نہ کہہ سکوں

کانوں میں گونجتی ہے صدائے درا ابھی
آئینے دے رہے ہیں تجھے راستا ابھی
روشن ہیں سنگِ رہ پہ ترے نقشِ پا ابھی
رہرو نہیں ہوں گر تجھے رہبر نہ کہہ سکوں

خوشبو ترے نفس کی ابھی تک ہوا میں ہے
تیری سحر کا رنگ تلاشِ صبا میں ہے
تیرا چراغ آج بھی دستِ دعا میں ہے
تیرہ شبی کو زلفِ معنبر نہ کہہ سکوں

تجھ پر جنوں کو ناز ہے اے صاحبِ جنوں
اک آفتابِ تازہ ترا اشکِ لالہ گوں
ہے سجدہ گاہِ شوق ترا معبدِ فسوں
حد ہے کہ تجھ کو عصر کا آذر نہ کہہ سکوں

نسبت تجھے شعارِ درِ مصطفیٰ سے ہے
جو نور ہے شرارِ درِ مصطفیٰ سے ہے
تیرا شرف غبارِ درِ مصطفیٰ سے ہے
تو امتحانِ جاں ہے سراسر نہ کہہ سکوں

اے دشتِ زندگی میں دلِ آرزو پناہ
ہر ایک کا نصیب کہاں ہے تری نگاہ
تیری نگہہ پہ فاش ہوا سر لا الہ
بے شک زباں سے تجھ کو پیمبر نہ کہہ سکوں[1]

[1] اقبال کی یاد میں: مرتبہ امجد اسلام امجد، ص ۷۲-۷۳

افتخار عارف

اقبالؒ کے حضور

نہال اقبال پھر تری سبز سبز شاخیں

بہار کے رنگ رنگ پھولوں سے سج رہی ہیں

وہ پھول جو گلشنِ محبت کی آبرو ہیں

وہ پھول جو تیرا خواب ہیں تیری آرزو ہیں

خدا انہیں سربلند رکھے

خدا انہیں ارجمند رکھے

نہال اقبال تیرے سائے

مسافرانِ قریبِ منزل کا حوصلہ ہیں

علم کشایانِ شہرِ حکمت کا سلسلہ ہیں

وہ حوصلہ جو وراثت انبیاء رہا ہے

وہ سلسلہ جو امانت اولیاء رہا ہے

خدا اسے برقرار رکھے

خدا اسے پائدار رکھے[1]

[1] صریرِ خامہ: (شعبہ اردو، سندھ یونیورسٹی، ۱۹۷۷ء) ص ۶۹

اقبال

رُوح کو چُھوتے ہُوئے ایک نظارے جیسا
تھا وہ اِک شخص یہاں صبح کے تارے جیسا

فکر تھی سب سے جُدا، خواب انوکھے اُس کے
پھر بھی لگتا تھا بہر رنگ ہمارے جیسا

پھیلتی جاتی ہے سارے میں وہی بانگِ درا
گونج میں جس کی ہُوا سَیل، کنارے جیسا

شام کی دُھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اُس کا چہرہ تھا گھنی شب میں ستارے جیسا

آئیں گے اور بھی دُنیا میں سخن ور لاکھوں
پر نہ ہوگا کوئی اقبال، تُمھارے جیسا[1]

[1] سحر آثار: امجد اسلام امجد، ص ۲۷۔۲۸

تصدق حسین خالد

اقبال

مرگ نے بھینچ لیا تیرے تنِ خاکی کو
تو مگر مر نہ سکا
قبر تیرے لئے آغوش کشا بیٹھی ہے
مرگ سمجھی تری منزل ہے یہی
"ان ستاروں سے پرے اور بھی دُنیائیں ہیں"
اسے معلوم نہ تھا
مرگ خود شہپر پرواز بنی
روح بیباک نے "خورشید کا سامان سفر تازہ کیا"
راہ تکتی ہی رہی قبر کہ اب آتا ہے
کتنی افسردہ و مایوس ہے قبر
قبر کی منزل تاریک ترا مسکن ہو؟
تو کہ "روشن ہے جبیں" تیری ستاروں کی طرح
بے خبر تھی ترے جوہر کی نوا تابی سے
گرمی عشق نے کی تیرے وہ مشعل روشن
جس کے شعلے کی لپک ہے ابدیت بکنار
مرگ بیٹھی ہی رہے گی ترے مرقد کے حضور
تو چہکتا ہی رہے گا سر دامانِ سحاب![1]

[1] بیادِ شاعرِ مشرق: ص ۸۷

خورشید رضوی

اکیس اپریل

موت نے پہلے جھک کر
قدم اُس کے چومے
اور اس سرد بوسے سے یخ بستہ ہوتی ہوئی جوئے خوں میں
بہی ــــــــــــــــ
اور اُس قلبِ بیدار کے سات چکّر لئے
اور اُس ذہنِ برّاق کی نور ہی نور دہلیز پر آ کے ٹھٹکی
"اجازت اگر ہو تو اس جگمگاتی مقدس امانت کو
اِن تیرہ ہاتھوں سے چھولوں ــــــــــــــــ!"
کہا ــــــــــــــــ "مرحبا!
اے فرستادہ خالقِ نیست و ہست و غیب و حضور
یہی حکم ہے تو خدوخالِ خورشید پر
پردۂ شب گرا دے
مگر ہوشیار!
آخری سانس کے ساتھ
جب تو مرے جسم خاکی سے نکلے
تو میرے لبوں پر لکھی مُسکراہٹ کو
پامال کر کے نہ جانا ــــــــــــــــ"[1]

[1] ضیابار: اقبال نمبر ۲، ص ۲۵۲

عبدالعزیز خالد

اقبال

اے خودی کے شاعرِ والا صفات — تجھ پہ آئینہ تھے اسرارِ حیات
سوز و ساز آرزو مندی سے تھی — روشن و پُر مایہ تیری کائنات
محترم، یکتائی دُرِّ یتیم — مُنکر دارائی لات و منات
تو نے درویشی کو دی شان کئی — تو نے ٹھکرائی خدائی کی زکات
تو نے کھولا اس طلسم راز کو — موت در پردہ ہے تمہید حیات
اشک و آہ و ذکر وفکر و زمزمہ — یہ ہیں تیری زندگی کے واقعات
سال و سن کی ہے عبث بحث و جدل — اصل شے ہیں ذہن و دل کے واردات
بے ہمہ ہو آدمی یا باہمہ — بے خودی ہو یا با خودی اثباتِ ذات
بن گیا تھا جو سخن برگ حشیش — ہے وہ تیرے لمس سے شاخ نبات
تیرے شعری پیکروں کے سامنے — خَم صنوبر قدبُتانِ سومنات
ہے محال و ممتنع تیرا کلام — تو نے دکھلائے بیاں کے مُمکنات
زندۂ جاوید ہے تیرا سخن — ہے زمانے کی طرح اس کو ثبات
تیری تمثیلیں سوادِ حرف میں — رات کے آنگن میں تاروں کی برات
تیری تشبیہیں پرت اندر پرت — حاملات و الذّات، مرضیکات
تیرے اندز تکلّم کی قتیل — محض الا طرافل حسان ناعمات
تیری پروازِ تخیّل دیکھ کر — محو حیرت فاعلاتن، فاعلات

ہے صریرِ خامہ آوازِ سروش	یہ خُدا کا ہاتھ ہے یا تیرا ہات
فکر و فن کا یہ مرقع دیکھ کر	ہم کو آیا اعتبارِ معجزات
حیطہ ادراک میں آتے نہیں	تیرے اکعیار و مقامات و جہات
خواب جو دیکھا تھا تو نے بن گیا	رفتہ رفتہ جلوۂ صبح نجات
بوئے عشق آتی ہے تیری قبر سے	ہے یہ کس کی تجھ پہ چشم التفات
لیتے رہنا خواب نوشیں کے مزے	سوتے رہنا شوق سے بعد ازوفات

ساری اُمت گوش بر آواز ہے
یا بلال قم فناد بالصلواۃ[1]

[1] بیادشاعرمشرق:ص۲۱۳۔۲۱۴

غلام جیلانی اصغر

مردِ درویش

ہمارے شہر سے گزرا تھا ایک مرد فقیر
گلیم پوش بھی تھا، صاحبِ سریر بھی تھا
عیاں تھی اُس کی نظر پر بلندی و پستی
وہ خود شناس خود آگاہ و باضمیر بھی تھا

☆

وہ ایک شخص جو سارے نگر سے واقف تھا
نظر نواز تھا اہل نظر سے واقف تھا
اُسے خبر تھی کہ یہ رات ڈھلنے والی ہے
طلوعِ صُبح سے پہلے سحر سے واقف تھا

☆

وہ شخص جس نے غلاموں کو سرفرازی دی
مزاجِ آہن و فولاد موم کو بخشا
نیا شعور دیا حُسن ذات کا اُس نے
غرورِ زیست غریبوں کی قوم کو بخشا

وہ شخص ہم میں نہیں ہے مگر یہ جانتا ہے
جو لوگ جسم دریدہ تھے گل بداماں ہیں
سفر کی گرد میں جو اَٹ گئی تھیں تصویریں
وفور نُور سحر سے وہ اب درخشاں ہیں

☆

وہ شخص ہم میں نہیں ہے مگر کلام اُس کا
کبھی زبورِ عجم ہے کبھی ہے بانگِ درا
پیامؔ زیست دیا اہلِ شرق کو اُس نے
خودی کے راز سے لوگوں کو روشناس کیا

☆

وہ شخص شہر سے گزرا تو کتنا تنہا تھا
جلو میں اُس کے مگر زندگی کا دریا تھا
چلا گیا ہے تو اب شہر کتنا تنہا ہے
وہ ایک شخص جو ہر شخص کا شناسا تھا [1]

[1] ضیابار: اقبال نمبر۲،ص۵۰۔۲۵۱

اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہوگئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا

اب دُور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اُس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اُس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اُس کی لے سے سیکڑوں لذّت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اُس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلہ جوّالہ تُند وتیز
اُس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمع بزم، صبح کی آمد سے بے نیاز

اقبال

تیرا جلال و جمال عکس خدا کی دلیل!
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل

تیری دُعا سے ملا، میری زمیں کو ثمن　　تیری نوا سے ملا حرف تحیر کو فن
تیری وفا سے ملا کاسۂ تسکیں کو دھن　　تیری نوا سے ملا صحرئے جاں کو چمن
نقش وفا کا بیاں، تیرے بیاں کی دلیل
زمزم دل کے لیے تیری صدا سلسبیل

تیری دُعا میں نہاں جذبہ خیرؐ البشر　　تیری صدا سے ملا قوم کو جذب رحیل
تیری نواؤں میں ہے پچھلے پہر کا فسوں　　تیرے تکلم میں ہے حوصلہ جبرئیل
کاش تمنا بھی ہو حسرتِ دل کا کفیل
میری دُعا بھی بنے تیری دعا کی مثیل

تیرے تصرف میں ہے شہرِ دعا کی جبیں　　تیرے تموج میں ہے سطوتِ سودائے دیں
تیرے تحکم میں ہے قامتِ قرض زمیں　　تیرے تکلّم میں ہے جلوتِ روزِ یقیں
میری تمنا سراب، میرے ارادے قلیل
تیری سخن پروری، میری دُعا کی سبیل[1]

[1] بیادِ شاعرِ مشرق: ناصر زیدی (مرتب) ص ۲۵۲

شاعرِ وطن

فروغِ مطلعِ اُمید ہے تُو جہاں میں زندہ جاوید ہے تُو
جو سچ پُوچھے تو تاریخِ اُمم میں نئے اک دور کی تمہید ہے تُو

تھی برق آواز تیری رُوح کی نَے تھی فکر افروز تیرے شعر کی مے
جہاں تو کیا نوا پردازِ اسرار حریمِ ذات میں گونجی تری لے

ترا ہر شعر سازِ قُدس کا راگ ترا الہام احساسات کی آگ
تری آواز، مشرق نیند کو تیاگ ترا پیغام، روحِ ایشیا جاگ!

تو سِرِّ دوسرا سے آشنا تھا خودی کے ارتقا سے آشنا تھا
مقامِ کبریا کو جانے والا مقامِ کبریا سے آشنا تھا

سرودِ زندگی گائے گا پھر کون دل کونین گرمائے گا پھر کون؟
ترے بعد اے حکیمِ فقر مَسلک خودی کا راز سمجھائے گا پھر کون؟

چمن میں مثلِ شبنم رہ گیا تو　　　گلوں کے داغِ سیما دھو گیا تُو
جگا کر خوابِ محکومی سے ہم کو　　　خود آغوشِ عدم میں سو گیا تو

قفس میں رہ کے اے مرغِ چمن زاد　　　ہلادی تو نے طرحِ جورِ صیّاد
سُنایا تو نے آزادی کا نغمہ　　　غلاموں کے وطن کے رندِ آزاد

جہاں میں دور ابھی آئیں گے لاکھوں
فلک کے طور ابھی آئیں گے لاکھوں
نہ آئے گا کوئی تجھ سا سخنور
سخنور اور بھی آئیں گے لاکھوں

اقبال

جھونکا تھا وہ ہوا کا، کرن ماہتاب کی
یا اوس کی لرزتی ہوئی کائنات تھا
پلکوں کے ساتھ چپکا ہوا تھا مثال اشک
یا وہ شجر سے ٹوٹا ہوا کوئی پات تھا

کس کو خبر کہ آیا تھا وہ کس جہان سے
اور کون سے جہان کی جانب چلا گیا
اتنی مگر خبر ہے کہ وہ تیرہ رات میں
سیّال بجلیوں کے بدن گد گدا گیا

جاتے رہے ہیں ساحلی شہروں سے ماہی گیر
اک بحر بے کنار و پُر اسرار کی طرف
وہ بحرِ بے خودی سے نکل کر رواں ہوا
اپنی خودی کے شہر پُر اسرار کی طرف

وہ شہر جس کا آخری شہری وہ آپ تھا
ایسے کھڑا تھا درد کی لہروں کے درمیاں
جیسے ہو کوئی پھولوں بھرا نخلِ سر بلند
بے آب جھیلوں، سوکھتی نہروں کے درمیاں [1]

[1] بیادِ شاعرِ مشرق: ص ۲۹۷

کتابیات

(الف) علامہ اقبال کے شعری مجموعے

(ب) علامہ اقبال کو منظوم خراج تحسین پر مبنی مجموعے

(ج) اردو فارسی کتب

(د) اخبارات و جرائد

(ہ) کتب فرہنگ اردو، انگریزی

(و) انسائیکلو پیڈیا

(ز) غیر مطبوعہ مقالہ جات

(الف)　　علامہ اقبال کے شعری مجموعے

☆ علامہ اقبال، پیام مشرق (لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۲۳ء)

☆ علامہ اقبال، کلیات اقبال (اردو) (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۶ء)

☆ علامہ اقبال، کلیات اقبال (فارسی) (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۸۵ء)

(ب)　علامہ اقبال کو منظوم خراج تحسین پر مبنی مجموعے

☆ آتش بہاولپوری، نذر اقبال (ہریانہ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۱ء)

☆ آغا صادق، زخمہ وساز (ملتان، مکتبہ آغا صادق، ۱۹۶۸ء)

☆ احسان الٰہی سالک (مرتب) (لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۷۷ء)

☆ اسد ملتانی، مرثیہ اقبال (ملتان، ادارہ روزنامہ شمس، ۱۹۳۸ء)

☆ اسلم انصاری، فیضان اقبال (ملتان، مجلس فکر اقبال، ۱۹۹۷ء)

☆ امجد اسلام امجد (مرتب)، اقبال کی یاد میں (لاہور، پنجاب آرٹس کونسل، ۱۹۷۷ء)

☆ بدر امروہی، سید محمد طفیل (مرتبین)، یادگار اقبال (لاہور، آزاد بک ڈپو، س۔ن)

☆ خالد شفیق، خالد بزمی (مرتبین)، یاد اقبال (لاہور، مجلس اردو، س۔ن)

☆ ذوالفقار احمد تابش (مرتب)، نذر اقبال (لاہور، اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۷ء)

☆ طاہر لاہوری، خودی ہے نورفشان (لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء)

☆ طفیل ہوشیار پوری، تجدید شکوہ (لاہور، احسان اکیڈمی، ۱۹۸۷ء)

☆ ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر، اقبال عرب شعرا کی نظر میں (لاہور، مکتبہ العلمیہ، ۱۹۷۷ء)

☆ عاصی مینائی، مرثیہ علامہ اقبال (مظفر گڑھ، م۔ن، س۔ن)

☆ عبدالحمید بٹ، خواجہ، یادگار اقبال (لودھراں، بزم اقبال، ۱۹۶۸ء)

☆ عقیل، عقیل الرحمٰن، نذر اقبال (حیدر آباد دکن، قومی شاعری فورم، ۱۹۷۷ء)

☆ غلام سرور فگار، یاد اقبال (لاہور، اقبال اکادمی، س۔ن)

☆ فضلی، فضل احمد کریم، نذر اقبال (کراچی، اقبال اکیڈمی، ۱۹۷۸ء)

☆ کریم اللہ کوکب، اقبال برما میں (برما، ادارہ حلقہ احمر، ۱۹۷۴ء)

☆ منشاء الرحمٰن منشاء، آئینہ اقبال (ناگپور، م۔ن، ۱۹۷۳ء)

☆ منظور عباس ازہر، عکس جمیل (لاہور، ابلاغ، ۱۹۹۵ء)

☆ مصباح الحق صدیقی و تسنیم کوثر (بحضور اقبال، م۔ن، س۔ن)

☆ ناصر زیدی (مرتب)، بیاد شاعر مشرق (لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء)

☆ محمد احمد خان (مرتب)، ارمغان دکن (کراچی، بہادر یار جنگ اکادمی، ۱۹۷۷ء)

(ج) اردو، فارسی کتب

☆ آبرو، دیوان آبرو (مرتبہ: ڈاکٹر محمد حسن) (نئی دہلی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰ء)

☆ آغا صادق، صبح صادق (لاہور، گلزار عالم پریس، س۔ن)

☆ احسان دانش، مقامات (لاہور، مکتبہ دانش، س۔ن)

☆ احمد حسن الزیات، تاریخ ادب عربی (لاہور، شیخ غلام اینڈ سنز، ۱۹۷۲ء)

☆ احمد ندیم قاسمی، دوام (لاہور، ادارہ مطبوعات، ۱۹۸۲ء)

☆ اشرف لطیفی (مرتب)، مطالعہ ادبیاتِ ایران (لاہور، تاج بک ڈپو، ۱۹۶۶ء)

☆ اکبر الٰہ آبادی، کلیاتِ اکبر (کراچی، پنجاب پبلشرز، س۔ن)

☆ الطاف حسین حالی، دیوانِ حالی (لاہور، میرزا راما برادرز پبلشرز، س۔ن)

☆ ......،مسدس مدوجزر اسلام (لاہور، تاج کمپنی، ۱۹۴۵ء)

☆ امجد اسلام امجد، سحر آثار (لاہور، جہانگیر بک ڈپو، ۱۹۹۸ء)

☆ امین حزیں سیالکوٹی، گلبانگ حیات (لاہور، سعد بک ڈپو، س۔ن)

☆ انجم رومانی، پس انداز (لاہور، القمر انٹرپرائزز، ۲۰۰۰ء)

☆ بدر امروہی (مرتب) تجلیات حشر (لاہور، تاج کمپنی، س۔ن)

☆ بصیرہ عنبرین، تضمیناتِ اقبال (لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۲ء)

☆ تحسین فراقی، ڈاکٹر، نقش اول (لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء)

☆ جعفر بلوچ (مرتب) ارمغان نیاز (لیہ، دارلکتاب، ۱۹۹۸ء)

☆ ......، اقبالیات اسد ملتانی (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۱ء)

☆ جعفر حسن جعفر و عبد المجید راہی (مرتبین)، مطلعین، (مظفر گڑھ، مظفر گڑھ اکادمی، ۱۹۷۴ء)

☆ جگن ناتھ آزاد، بیکراں (نئی دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۲ء)

☆ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد اول) (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء)

☆ جوش ملیح آبادی، سیف و سبو (لاہور، مکتبہ اردو، س۔ن)

☆ حامد حسن قادری، تاریخ مرثیہ گوئی (دھلی، ہمالیہ بک ہاؤس، ۱۹۷۳ء)

☆ حفیظ جالندھری، کلیات حفیظ (مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا) (لاہور، مکتبہ عالیہ، ۲۰۰۵ء)

☆ ......، شاہنامہ اسلام (لاہور، ایوان اردو، س۔ن)

☆ حنیف کیفی، ڈاکٹر، اردو میں نظم معری اور آزاد نظم (لاہور، ابوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء)

☆ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اردو میں قطعہ نگاری (لاہور، ضیائے ادب، س۔ن)

☆ خورشید رضوی، ڈاکٹر، تالیف (لاہور، شہ تاج مطبوعات، ۱۹۹۵ء)

☆ ......،عربی شاعری ایک تعارف (لاہور، شیخ زاید اسلامک سنٹر، ۲۰۰۱ء)

☆ رحیم بخش شاہین (مرتب) اوراق گم گشتہ (لاہور، اسلامک پبلی کیشنز، ۱۹۷۵ء)

☆ رشید احمد صدیقی، اقبال شخصیت اور شاعری (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۷۷ء)

☆ رضا زادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران (تہران، ۱۳۴۲ھ)

☆ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف ادب (لاہور، سنگ میل، ۱۹۹۱ء)

☆ ......، اقبالیاتی جائزے (لاہور، گلوب پبلیشرز، ۱۹۹۰ء)

☆ .....، خطوط اقبال (لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۶ء)

☆ ریاض مجید، ڈاکٹر، اردو میں نعت گوئی (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء)

☆ ساحر لدھیانوی، تلخیاں (کراچی فہیم پبلشنگ ہاؤس، س۔ن)

☆ سعدی شیرازی، بوستان سعدی (غلام حسین یوسفی) (تہران، چاپ خانہ سحاب، ۱۳۸۲ھ)

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، ایران میں اقبال شناسی کی روایت (لاہور، سنگ میل، ۱۹۸۳ء)

☆ سلیم اختر، ڈاکٹر، اقبال ممدوح عالم (لاہور، بزم اقبال، ۱۹۷۸ء)

☆ شبلی نعمانی، علامہ، شعر العجم (جلد پنجم) (الہ آباد، مطبع انوارِ محمدی، س۔ن)

☆ شورش کاشمیری، گفتنی و ناگفتنی (لاہور، چٹان پرنٹنگ پریس، س۔ن)

☆ شیخ عطاء اللہ (مرتب) اقبال نامہ (اول) (لاہور، اقبال اکادمی، ۲۰۰۴ء)

☆ صابر کلوروی (مرتب) اقبال کے ہم نشین (لاہور، مکتبہ خلیل، ۱۹۸۵ء)

☆ ....، کلیات باقیات شعر اقبال (لاہور، اقبال اکادمی، ۲۰۰۴ء)

☆ صبا حسنی، چراغ جلتے رہے (لاہور، ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۸۵ء)

☆ طاہر تونسوی ڈاکٹر (مرتب)، اقبال اور مشاہیر (لاہور، ادارہ معارف اسلامی، ۱۹۸۱ء)

☆ ظفر علی خان، نگارستان (لاہور، مکتبہ کاروان، س۔ن)

☆ ....، بہارستان (لاہور، یونائیٹڈ پبلشرز، ۱۹۴۸ء)

☆ عاصی کرنالی، چمن (ملتان، مکتبہ اہل قلم، ۱۹۸۶ء)

☆ عاصی مینائی، مرثیہ حضرت علامہ اقبال (م۔ن، مظفر گڑھ، س۔ن)

☆ عبدالحمید عرفانی، خواجہ، اقبال ایران (سیالکوٹ ، بزم رومی، ۱۹۸۶ء)

☆ ....، اقبال ایرانیوں کی نظر میں (کراچی، اقبال اکادمی، ۱۹۵۷ء)

☆ عبدالرؤف عروج (مرتب) رجال اقبال (کراچی، نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۸ء)

☆ عبدالقادر، شیخ، نذر اقبال (مرتب محمد حنیف شاہد) (لاہور، بزم اقبال، ۲۰۰۴ء)

☆ عبداللہ نیاز، راجا، صبح سخن (مرتب جعفر بلوچ) (لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۳ء)

☆ علی احمد رفعت، عربی ادب (بہاولپور، اردو اکادمی، ۱۹۶۲ء)

☆ غالب، اسداللہ خاں، دیوان غالب (مرتبہ حامد علی خان) (لاہور، الفیصل پبلشرز، ۱۹۹۵ء)

☆ غلام حسین ذوالفقار، اقبال ایک مطالعہ (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۸۷ء)

☆ غلام رسول مہر، مطالب بانگ درا (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۶ء)

☆ غلام علی آزاد بلگرامی، بحر الفصاحت (لکھنو، مطبع نول کشور، ۱۹۶۲ء)

☆ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت (لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)

☆ فضل حق، قاضی سخن وران ایران (لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۹ء)

☆ فضل الرحمٰن، بہار بوستان سعدی (ملتان، مکتبہ شرکت علمیہ، ۱۴۰۰ھ)

☆ فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا (لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۸۴ء)

☆ کسریٰ منہاس، فن تاریخ گوئی (لاہور، ادارہ نقوش، ۱۹۸۹ء)

☆ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، لاہور میں اردو شاعری کی روایت (لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۱ء)

☆ مجید امجد، کلیات مجید امجد (لاہور، ماورا پبلشرز، ۱۹۸۹ء)

☆ محسن کاکوروی، کلیات محسن (لکھنو، یوسفی پریس، س۔ن)

☆ محمد حسین آزاد، آب حیات (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۵۷ء)

☆ محمد رفیع سودا، کلیات سودا (مرتبہ عبدالباری آسی) (لکھنو، مطبع نول کشور، ۱۹۳۲ء)

☆ محمد شاہ دین ہمایوں، جذبات ہمایوں (لاہور، مرکنٹائل پریس، س۔ن)

☆ محمد عبداللہ قریشی، عبدالواحد معینی (مرتبین) باقیات اقبال (لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۶۶ء)

☆ محمد عبداللہ، قریشی، معاصرین اقبال کی نظر میں (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء)

☆ مرتضیٰ جعفری، سید، منتخب قصیدے (پشاور، عظیم پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۶۸ء)

☆ مظفر حسین برنی (مرتب) ،کلیات مکاتیب اقبال (اول) (دھلی، اردو اکادمی، ۱۹۹۹ء)

☆ معین الدین عقیل (مرتب)، کلام نیرنگ (کراچی، مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۳ء)

☆ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا، ادب نامہ ایران (لاہور، یونیورسٹی بک شاپ، س۔ن)

☆ نادر کاکوروی، جذبات نادر (کراچی، اردو اکادمی سندھ، س۔ن)

☆ نعیم صدیقی، پھر ایک کارواں لٹا (لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۹۲ء)

☆ نظامی عروضی سمرقندی، چہار مقالہ (لائیڈن، ۱۳۲۶ھ)

☆ نظیر اکبر آبادی، کلیات نظیر (لکھنو، نول کشور پریس، ۱۹۵۱ء)

☆ ن۔م۔ راشد، ایران میں اجنبی (لاہور، گوشہ ادب، ۱۹۵۷ء)

(د) اخبارت ورسائل

☆ اردو (اقبال نمبر) دہلی، اکتوبر ۱۹۳۸ء

☆ افکار، کراچی، ۱۹۷۷ء

☆ اقبال (گورنمنٹ کالج لاہور) لاہور، ۱۹۷۰ء

☆ اقبال ریویو، لاہور، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۸۵ء

☆ اوج (نعت نمبر) گورنمنٹ کالج شاہدرہ، لاہور، ۱۹۹۲ء۔۱۹۹۳ء

☆ برگ گل، گورنمنٹ کالج سمندری، فیصل آباد، اپریل ۱۹۸۷ء

☆ بشارت، مظفر گڑھ، ۳۰ ستمبر ۱۹۲۳ء

☆ تاج (اقبال نمبر) لاہور، جولائی ۱۹۳۸ء

☆ جام نو (اقبال نمبر) کراچی، اگست ۱۹۷۷ء

☆ جوہر (اقبال نمبر) نئی دہلی، نومبر ۱۹۳۸ء

☆ راوی، لاہور، فروری ۱۹۳۳ء

☆ سب رس (اقبال نمبر) حیدرآباد دکن، جون ۱۹۳۸ء

☆ سیارہ (اقبال نمبر) لاہور، مئی ۱۹۶۳ء

☆ سیارہ، لاہور، جنوری، فروری، مارچ ۱۹۷۸ء

☆ صریر خامہ، سندھ یونیورسٹی، حیدرآباد، ۱۹۷۷ء

☆ ضیابار، گورنمنٹ کالج، سرگودھا، ۱۹۷۳ء، نومبر ۱۹۷۷ء

☆ فیض الاسلام، راول پنڈی، جنوری ۱۹۷۸ء

☆ کشت نو (اقبال نمبر) زرعی یونیورسٹی، فیصل آباد ۱۹۷۷ء

☆ ماہ نو، اسلام آباد، نومبر ۲۰۰۲ء

☆ ماہ نو، کراچی، اپریل ۱۹۷۰ء

☆ مہک گوجرانوالہ، ۱۹۷۷ء

☆ نقوش، لاہور، ستمبر ۱۹۷۷ء

☆ نیرنگ خیال، لاہور، ۱۹۳۲ء، ستمبر ۱۹۷۷ء

(ہ) کتب فرہنگ اردو و انگریزی

☆ فرہنگ آصفیہ (جلد اول) سید احمد دہلوی (لاہور، سنگ میل، ۱۹۸۶ء)

☆ فرہنگ آصفیہ (جلد دوم) سید احمد دہلوی (لاہور، سنگ میل، ۱۹۸۶ء)

☆ فرہنگ آصفیہ (جلد سوم) سید احمد دہلوی (لاہور، سنگ میل، ۱۹۸۶ء)

Arabic English Dictionary, Beirut: Catholic Press 1964

(و) انسائیکلوپیڈیا

☆ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۱۸) پنجاب یونیورسٹی، لاہور

☆ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد ۲۰) پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Encyclopedia of Arabic Literature edited by Jolia Scott Meisani
and Routledge Starkey Routledge London & New York Vol. I, 1998

(ز) غیر مطبوعہ مقالہ جات

☆ جمیل اصغر، اقبال کے مقلد اردو شعرا، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (مقالہ برائے ایم۔فل اقبالیات)، اسلام آباد ۱۹۹۵ء

☆ مہر افروز درانی، اردو شاعری پر اقبال کے اثرات (مقالہ ایم۔اے اردو)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۵ء